وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

بحیثیت شارع ومقنن

ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ
جسٹس شیخ عبدالحمید
ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ
ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی

SHARI'AH ACADEMY
اکادیمیۃ الشریعۃ
1985 ١٤٠٦
ISLAMABAD PAKISTAN
INTERNATIONAL ISLAMIC UNIVERSITY

شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا [الحشر ۸]

رسول تمہیں جو دیں اسے لے لو اور وہ جس سے روک دیں اس سے باز آ جاؤ

رسول اللہ ﷺ بحیثیت شارع و مقنّن

شریعہ اکیڈمی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

نام کتاب	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت شارع ومقنن
مصنفین	ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ
	جسٹس شیخ عبدالحمید
	ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی
	ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ
نظر ثانی	ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی
صدر شعبہ تحقیق ومطبوعات	ڈاکٹر اکرام الحق یٰسین
ناشر	شریعہ اکیڈمی
	بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
کمپوزنگ	محمد انور
مطبع	ادارہ تحقیقات اسلامی
	بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
طبع اول	۲۰۰۵ء
طبع دوم	جون ۲۰۱۳ء
تعداد	۱۰۰۰

ISBN 969-8263-36-5

فہرست

پیش لفظ

سیرت نگاروں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ہر ہر پہلو کو ہر دور اور ہر زمانہ میں اپنے علم اور صلاحیتوں کے مطابق اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا کوئی گوشہ اور کوئی پہلو ایسا نہیں جو مخفی رہ گیا ہو۔ عادات و اخلاق سے لے کر غزوات اور نظم مملکت تک، عائلی زندگی سے لے کر بین الاقوامی تعلقات تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسلوب اور طریق کار کا بغور مطالعہ کرنے اور ان سے زندگی کے رہنما اصول وضوابط اخذ کرنے کی کوششیں کی ہیں۔

یوں تو سیرت کا ہر پہلو ہر دور اور ہر زمانہ میں امت مسلمہ کے لیے بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے لیکن حالات و زمانہ کے اعتبار سے بعض پہلوؤں کو از سرِ نو اجاگر کرنا زیادہ ضروری ہوتا ہے۔ ہمارے خیال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریعی حیثیت کو مدلل وعلمی انداز میں پیش کرنا اس دور کی اہم ضرورت ہے۔

سیرت طیبہ کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ منصب نبوّت و رسالت کو پہلے اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ مقامِ رسالت کی تفہیم کے لیے دو باتیں بہت اہم ہیں:

ایک یہ کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانا اتنا ہی ضروری ہے جتنا

توحید و آخرت پر ایمان لانا۔ ایمان اس تصدیق قلبی یا یقین محکم کا نام ہے جو انسان کی زندگی کا مقصد، دنیا میں اس کی حیثیت اور اس کائنات کے بارے میں نقطہ نگاہ کو یکسر بدل دیتا ہے۔

دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ رسول پر ایمان لانے کے بعد رسول علیہ السلام کی یہ حیثیت متعین ہو جاتی ہے کہ وہ ہر حالت اور ہر صورت میں واجبِ اطاعت اور واجبِ اتباع ہے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حیثیت اور مقام کو نہ کسی طرح کم کیا جا سکتا ہے اور نہ اسے چیلنج کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم کی اس آیت پر غور کیجئے:

يَآأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوٓا أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُوْلَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ ۚ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّأَحْسَنُ تَأْوِيْلًا

[النساء ۴:۵۹]

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور اللہ تعالیٰ کے رسول کی اطاعت کرو اور اُن لوگوں کی بھی اطاعت کرو جو تم میں سے صاحب اختیار ہوں۔ ہاں اگر تمہارے درمیان کسی بھی معاملہ میں اختلاف ہو جائے تو اس صورت میں اس معاملہ کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی طرف لوٹا دو اگر تم اللہ تعالیٰ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو، یہی اچھا طریقہ ہے اور اس کا انجام بھی بہت اچھا ہے۔

اس آیتِ مبارکہ کے پہلے حصہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم

کی اطاعت کا حکم ہے۔ ساتھ ہی امت کے جو لوگ اولوالأ مر مقرر ہوں ان کی اطاعت کو بھی ضروری قرار دیا گیا (کیونکہ اس کے بغیر معاشرہ کا نظم ونسق چلانا ممکن نہیں) آیتِ مبارکہ کے دوسرے حصّہ میں حکم یہ ہے کہ اگر کسی معاملہ میں اختلاف رائے ہو جائے تو اختلاف کو دور کرنے کے لیے اصولی ہدایت یہ دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور رسول علیہ السلام کی سنت کی طرف رجوع کیا جائے۔

اس حصّہ کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے چند پہلوؤں پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ اہل ایمان میں اختلاف رائے صرف ان مسائل میں ہوسکتا ہے جو صراحتاً نصوص میں مذکور نہ ہوں، دوسرے یہ کہ اس آیت میں فِــي شــيءٍ نکرہ استعمال ہوا ہے جو عموم پر دلالت کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس قسم کا بھی مسئلہ پیش آ جائے، خواہ وہ مسائل عبادات سے متعلق ہوں یا معاملات اور امور دنیا سے، قرآن وسنّت کی روشنی ہی میں اس کا حل تلاش کیا جاسکتا ہے اور ایسا کرنا واجب ہے۔ تیسرے یہ کہ ایسا کرنے کو ایمان سے منسلک کر دیا گیا ہے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو تمہیں ایسا ضرور کرنا چاہیے۔ چوتھی بات یہ ہے کہ اگر تم اس ضابطہ پر عمل کرو گے تو اس کے بہتر نتائج اور ثمرات سے دنیا اور آخرت میں تمہی بہرہ مند ہو گے۔

یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر ایک مدلل گفتگو کی ضرورت ایک عرصہ سے محسوس کی جارہی تھی، اس لیے کہ موجودہ دور میں بعض حضرات کی جانب سے یہ بات زور وشور سے کہی جارہی ہے کہ قرآن وسنّت کی رہنمائی صرف امورِ عبادات یا بقول ان کے مذہبی معاملات تک محدود ہے اور جہاں تک دیگر معاملات کا تعلق ہے، وہاں انسان اپنے امور کو

خود طے کر سکتا ہے، اسے وحی کی رہنمائی کی ضرورت نہیں، یا بسا اوقات دین کا صحیح فہم نہ ہونے کی وجہ سے یہ تصور قائم کر لیا جاتا ہے کہ دین و مذہب کی رہنمائی صرف ان امور تک محدود ہے جنہیں وہ اپنے تئیں دینی امور سمجھتے ہیں اور معاملات یا نظم سلطنت وحکومت میں اس کا کوئی کردار تسلیم نہیں کرتے۔

اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے ہم نے اس موضوع پر ایک مختصر کتاب شائع کرنے کا ارادہ کیا جس میں ان اہلِ علم حضرات کے مضامین کا انتخاب کیا گیا ہے جن کی علمی وفکری حیثیت مسلمہ ہے۔ اس انتخاب میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم کا مضمون ''عہدِ نبویؐ میں نظام تشریع وعدلیہ'' خطباتِ بہاولپور سے ماخوذ ہے۔ دوسرا مضمون معروف قانون دان جسٹس شیخ عبدالحمید کا ''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت قانون ساز'' ہے جو سیارہ ڈائجسٹ کے رسول نمبر میں شائع ہوا تھا، ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب نے اسلام کے قانونِ بین الممالک پر اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور میں بارہ لیکچرز دیئے تھے جنہیں یونیورسٹی نے خطبات بہاولپور۔۲ کے عنوان سے ۱۹۹۷ء میں شائع کیا تھا، اس کتاب سے ایک خطبہ سے ماخوذ مضمون ''رسول اکرم اور قانونِ بین الممالک: ہجرتِ حبشہ اور میثاق مدینہ کی روشنی میں'' اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ یہ تینوں حضرات نامور اہلِ علم ہیں اور ان کی تحریریں بہت مدلل ہیں۔ موضوع کی مناسبت سے ایک مضمون ''رسول اللہ بحیثیت شارع ومقنن'' احقر کا بھی شامل ہے۔

اس کتاب میں شامل اہلِ علم کے مقالات بغیر کسی ترمیم واضافہ کے شامل کیے گئے ہیں، البتہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم کے مضمون میں آیات اور ان کا ترجمہ اور کچھ

ضروری حوالہ جات کا کام کیا گیا ہے، اسی طرح جسٹس شیخ عبدالحمید اور ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب کے مقالوں کے حوالہ جات کی تخریج وحواشی کا کام ہوا ہے جو شریعہ اکیڈمی کے عرفان خالد ڈِھلوں صاحب اور جنید ہاشمی صاحب کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

ہمیں امید ہے کہ ہماری یہ کاوش نہ صرف اہلِ علم اور قانون دان حضرات کے لیے مفید ہوگی بلکہ عام حضرات بھی اس سے استفادہ کرسکیں گے اور سنّت طیبہ کی دستوری و تشریعی حیثیت کو دلائل کی روشنی میں سمجھ سکیں گے۔

محمد یوسف فاروقی

ڈائریکٹر جنرل

۱۲۔ ربیع الاوّل ۱۴۲۶ھ / ۲۲۔ اپریل ۲۰۰۵ء

بروز جمعۃ المبارک

علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ

نعت

لوح بھی تُو، قلم بھی تُو، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرۂ ریگ کو دیا تُو نے طلوعِ آفتاب
شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقر جنیدؒ و بایزیدؒ، تیرا جمالِ بے نقاب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب
تیری نگاہِ ناز میں دونوں مراد پا گئے
عقلِ غیاب و جستجو، عشقِ حضور و اضطراب

☆☆☆☆

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

عہدِ نبویؐ میں نظامِ تشریع وعدلیہ

آج کا مضمون دو ایسے موضوعوں سے متعلق ہے جن میں بے شمار باتیں تشریح طلب ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان سب پر ایک مختصر تقریر میں جیسی روشنی چاہیے، نہیں ڈالی جا سکتی۔ آج کے لیکچر میں دو مسئلوں پر خصوصی بحث کرنی ہے: ایک ''قانون سازی'' اور دوسرے ''عدلیہ'' جس کی غرض کے لیے قانون سازی ہوتی ہے۔ جہاں تک قانون سازی کا تعلق ہے، دو تمہیدی باتیں ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ اوّل یہ کہ قانون دو طرح سے بنتا ہے۔ ایک یہ کہ نامعلوم زمانے سے رسوم ورواج کی صورت میں کوئی قاعدہ چلا آرہا ہو اور ہمیں بالکل معلوم نہ ہو کہ اس کا بنانے والا کون تھا، وہ کتنے عرصے سے چلا آرہا ہے اور اس کی تاریخ کیا رہی ہے؟ دوسری قسم قانون کی وہ ہوتی ہے جسے معلوم المصنف کہہ لیں یعنی اس کے بنانے والے کا ہمیں علم ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی بادشاہ، کوئی حکمران جو ایک قاعدہ اپنے ماتحت لوگوں کے لیے مقرر کرتا ہے اور وہ اس کی تعمیل کرتے ہیں۔ کبھی اسے ایک معلوم انسان ہی پیش کرتا ہے، لیکن یہ کہتے ہوئے کہ یہ میرا بنایا ہوا قانون نہیں بلکہ خدا کے احکام ہیں۔ مگر ان میں بنیادی فرق یہ ہے کہ رسم ورواج کے متعلق ہمیں معلوم نہیں ہوتا کہ وہ قانون کیسے بنا؟ ممکن ہے اس کا کوئی جزء تو ایسا ہو جو خدائی احکام کے طور پر کسی پیغمبر کے ذریعے ہم تک پہنچا ہو، جسے ہم فراموش کر گئے ہوں اور وہ عمل ہماری عادت بن گیا ہو اور بطور نتیجہ اس عمل کو ہم نے جاری رکھا ہو۔ قانون اصل میں دو طرح کے

ہیں: ایک خالص انسانی قانون اور دوسرا خدائی قانون۔ ایک تمہیدی مگر اہم بات یہ ہے کہ قانون بن جانے کے بعد اس کو ایک مماثل درجے کا اقتدار رکھنے والی مماثل درجے کی شخصیت ہی بدل سکتی ہے۔

اس کی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ یونیورسٹی کا ایک پروفیسر اپنی جماعت کے اندر ایک حکم دے تو کوئی طالب علم یا دفتر کا کوئی ادنیٰ ملازم اس کو بدل نہیں سکتا، البتہ وائس چانسلر اسے بدل سکتا ہے یا وائس چانسلر سے بھی بڑی شخصیت وزیر تعلیم یا ملک کا حکمران اسے بدل سکتا ہے، لیکن بنانے والے سے کمتر مرتبے کا شخص نہیں بدل سکتا۔ اس قاعدے اور اصول کے اثرات بہت دوررس ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی قانون اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہو تو اس کو بدلنے والا اللہ ہی ہوسکتا ہے۔ خدا سے کم تر رتبے کا کوئی فرد اس کو بدلنے کا اختیار نہیں رکھتا اور اگر بدلے تو وہ ملحد ہوگا، اللہ کو نہ مانتا ہوگا۔ اللہ کے بعد پیغمبر اپنے ذاتی اجتہاد سے کوئی قانون بنا سکتا ہے جب کہ اسے وحی نہ آئی ہو۔ وہ اپنی صوابدید اور ملکہ استدلال سے حکم دیتا ہے تو اب اس قانون کو کوئی پیغمبر ہی بدل سکتا ہے۔ پیغمبر سے کمتر درجے کی کوئی شخصیت مثلاً کوئی بادشاہ، کوئی مجتہد، کوئی فقیہ اس کو بدلنے کی قابلیت نہیں رکھتا۔ البتہ اللہ کی ذات پیغمبر کے حکم کو بدل یا منسوخ کرسکتی ہے یعنی قانون بدلنے کا بھی ایک معیار ہے۔ مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ اگر توریت میں کوئی حکم ہو تو انجیل یا قرآن مجید سے اسے بدل سکتے ہیں کیوں کہ وہ بھی اللہ کے احکام کا مجموعہ ہیں۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اقوال کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال سے بدل سکتے ہیں۔ غرض پیغمبروں کے احکام کو یا تو اللہ کی ذات بدلے گی یا کوئی اور پیغمبر ہی وحی کے ذریعے سے بدل سکے گا۔

اس پس منظر میں اب ہم یہ دیکھیں گے کہ اسلامی قانون کس طرح بنتا ہے؟

جہاں تک اسلام کی تاریخ کا تعلق ہے تو عہدِ نبوی، ہم جانتے ہیں کہ غارِ حرا میں پہلی وحی کی

تاریخ سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک تیئس سال کے عرصے پر مشتمل رہا اور یہ کہ اسلام کا اساسی ماٰخذ قانون یعنی قرآن مجید ایک دم نازل نہیں ہوا۔ وہ کتابی صورت میں یا تختیوں پر لکھے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قانون کی طرح ہم تک نہیں پہنچا بلکہ تیئس (۲۳) سال کے عرصے میں وقتاً فوقتاً نازل ہونے والی آیات کی صورت میں امت تک پہنچایا گیا۔ ان حالات میں بہت ہی سادہ اور بدیہی بات یہ ہے کہ غارِ حرا میں جس وقت پہلی وحی یعنی سورۃ اقراء [العلق] کی ابتدائی پانچ آیات نازل ہوئیں، اس وقت اسلامی قانون موجود نہیں تھا۔ قرآن مجید یا حدیث میں جو احکام آئے وہ رفتہ رفتہ بعد میں آئے۔ سوال یہ ہے کہ اسلام کی ابتداء میں اسلامی قانون کیا تھا؟ قرآنی اشارات کی بناء پر اور تاریخ عہدِ نبوت کی روشنی میں ہم پورے ادب کے ساتھ بیان کر سکتے ہیں کہ شہر مکہ کے جو بھی رسم و رواج تھے، وحی کی غیر موجودگی میں وہی مسلمانوں کا قانون تھا اور وہ اس پر عمل کرتے رہے۔

مثلاً شراب کی ممانعت ہجرت کے کئی سال بعد نازل ہوئی(۱)۔ ان آیات کا شانِ نزول یہ ہے کہ ایک دن ایک صحابی نے شراب پی لی تھی۔ وہ نشے کی حالت میں تھے کہ نماز پڑھائی تو سورۃ الکافرون کی آیات اس طرح پڑھ ڈالیں جس سے معنی الٹ گئے اور جو چیز ناگفتنی تھی وہ ان کی زبان سے نکل گئی (۲)۔ تو اس سلسلے میں قرآن مجید کی وہ آیات نازل ہوئیں جن میں شراب پینے کو حرام قرار دیا گیا۔ دوسرے الفاظ میں یہ حکم آنے تک شراب کا پینا واجب تو نہیں، جائز تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تو کبھی شراب نہیں پی، لیکن کچھ صحابہ اس سے ضرور دل بہلائی کرتے رہے۔ یہی حال اور سارے احکام کا ہے۔ پہلی وحی میں اگرچہ بت پرستی کی ممانعت کی گئی تھی لیکن اور احکامِ ممانعت کا اس میں کوئی ذکر نہیں ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض ممنوعات کی عقل بھی متقاضی ہے۔ مثلاً چوری

نہیں کرنی چاہیے، کسی بے قصور کو جان سے نہیں مارنا چاہیے اور کسی کو دھوکہ نہیں دینا چاہیے۔ انسانی فطرت اور انسانی عقل بھی ان کو نامناسب سمجھتی ہے۔ ان کی ممانعت تو جاری رہ سکتی ہے، لیکن جن چیزوں کے متعلق انسانی رائے میں اختلاف ہوسکتا ہے مثلاً شراب کا پینا، سؤر کا گوشت کا کھانا، ان پر اگر اہل مکہ عمل کرتے رہے ہوں اور اس کی ممانعت ابھی تک نہ آئی ہو تو مسلمانوں کے لیے اس پر عمل کرنا جائز قرار دیا جائے گا۔ وہ اسلامی قانون ہی ہوگا، اگرچہ عارضی اور قابلِ تبدیلی قانون ہو لیکن بہرحال اسلامی قانون ہی ہوگا۔ وحی اور قرآن کی بحث کے ضمن میں ایک اور چیز کا ذکر کرنا ناگزیر ہے جسے اصول فقہ کی کتابوں میں شرائع من قبلنا کا نام دیا گیا ہے، یعنی اسلام سے قبل کے صحفِ سماوی۔ ان کا ذکر قرآن مجید میں کئی بار آیا ہے۔ سب سے اہم صراحت سورۃ الانعام میں ہے جہاں کوئی بیس پیغمبروں کا نام لینے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ

[الانعام۶: ۸۳تا۹۰]

یعنی مذکورہ بالا لوگ وہ ہیں جن کو خدا ہی نے صحیح راستہ بتایا ہے اس لیے (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ بھی انہیں کے راستے کی اقتداء کریں۔

نتیجہ یہ ہے کہ اگر پرانی خدائی کتاب ہم تک پہنچے، اس کی صحت کا اطمینان ہو اور اس کتاب کے احکام کو قرآن نے یعنی خدا نے بعد میں منسوخ بھی نہ کیا ہو تو وہ پرانے نبی کی وحی مسلمانوں پر بھی واجب التعمیل رہے گی، کیوں کہ وہ خدا ہی کے حکم پر مشتمل تھی اور خدا کا حکم اگر خدا ہی نہ بدلے تو وہ برقرار رہے گا۔ ہمارے فقہاء نے ایسی بہت سی مثالیں دی ہیں، چند کا ذکر کرتا ہوں جن سے مفہوم آپ پر واضح ہو جائے گا۔ چنانچہ سورۃ المائدۃ میں خدا فرماتا ہے:

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنفَ بِالْأَنفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ [المائدة ۵:۴۵]

ہم نے یہودیوں کے لیے توریت میں حکم دیا ہے کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور زخموں کا بدلہ ان کے برابر

صراحت سے یہ توریت کا اور یہودیوں سے مختص قانون ہونے کے باوجود اسلامی قانون کا جزء بن جاتا ہے۔

ایک دوسری مثال سورۃ النور میں ہے:

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ

[النور ۲۴:۲]

زنا کار مرد اور زنا کار عورت دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو

اس آیت میں غیر شادی شدہ زنا کار مرد اور عورت کو ایک ایک سو درّے یا کوڑے مارنے کا حکم ہے لیکن شادی شدہ لوگوں کے زنا کا کوئی ذکر قرآن میں نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ایسے (شادی شدہ) لوگوں کی زنا کاری پر توریت اور انجیل دونوں میں رجم کرنے کا حکم موجود ہے اور صحیح بخاری وغیرہ کے مطابق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی صحت کی توثیق بھی فرمائی ہے۔ لہٰذا جس توریتی اور انجیلی حکم سے قرآن نے سکوت کیا وہ برقرار رہے گا۔ چنانچہ اسلام میں بھی رجم کے حکم کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور بعد کے سارے خلفاء اور فقہاء نے برقرار سمجھا اور نافذ کیا۔ غرض شرائع من قبلنا بھی اسلامی قانون کا ایک مأخذ ہیں بشرطیکہ ان کی صحت کا ثبوت ملے اور قرآن و حدیث نے ان کو بدلنے کا حکم نہ دیا ہو۔

اسلامی قانون کا دوسرا ماٰخذ حدیث وسنت ہیں اور وہ قیامت تک برقرار تو رہتے ہیں لیکن ان کا بننا اور بدل سکنا ایک محدود زمانے یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں وقوع میں آتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ان کے بننے اور بدلنے کا زمانہ ختم ہو جاتا ہے۔ وہ ہمارے پاس محفوظ رہتے ہیں۔ اس کے بعد ان میں تبدیلی غیر ممکن ہو جاتی ہے۔

اس مختصر صحبت میں یہ تو ممکن نہیں کہ تفصیل کے ساتھ بتاؤں کہ قرآن وسنّت میں کون سا قانون پہلے آیا، پھر تیئیس (۲۳) سال کے عرصے میں اس میں کیا تبدیلی اور اضافے ہوئے۔ لیکن مجموعی طور پر ہم یہ پیش نظر رکھیں گے کہ قرآن مجید کے ذریعے سے جو احکام آئے وہ خدائی حکم کے طور پر ہمارے پاس آئے اور اس میں تبدیلی اور تو اور خود پیغمبر بھی اپنی ذاتی رائے سے نہیں کر سکتا۔ اس طرح سنّت کے ذریعے سے جو احکام ہم تک پہنچتے رہے ان کی دو اقسام ہیں:

ایک قسم یہ ہے کہ وحی والہام کے ذریعے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچے ہیں اور اس شرط یا اس صراحت کے ساتھ کہ انہیں قرآن میں داخل نہ کیا جائے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ ذکر ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْىٌ يُّوْحٰى

[النجم ۵۳: ۳ تا ۴]

پیغمبر جو چیز بھی بیان کرتا ہے وہ اپنی ذاتی خواہش کی وجہ سے نہیں ہوتا ہے بلکہ خدا ہی کی وحی ہوتی ہے جو اس تک پہنچائی جاتی ہے۔

اگر پیغمبر کی بیان کردہ چیزیں قرآن میں داخل نہ کی گئی ہوں تو مسلمانوں کا عقیدہ یہی ہوتا ہے کہ وہ الہام کے ذریعے پیغمبر تک پہنچی ہیں اور پیغمبر نے پوری دیانت سے ہم تک پہنچائی ہیں۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ کسی مسئلے میں احکام کی ضرورت ہو، قرآن میں وہ

احکام ہمیں نہ ملتے ہوں اور وحی کا انتظار ہو مگر وحی آتی نہیں تو ان حالات میں اگر معاملہ ایسا ہے کہ جس میں انتظار کیا جا سکتا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انتظار کرتے ہیں لیکن معاملہ فوری ہو تو وہ مجبور ہوتے ہیں کہ اجتہاد و استنباط اور استدلال کر کے، اپنی صوابدید سے کوئی حکم دیں۔ ایسے حکم کی دو صورتیں ہوں گی: یا تو خدا اس کی توثیق کر دے گا یا خدا اس کو نامناسب سمجھے تو تبدیلی کا حکم دے گا۔ اس بارے میں ایک معقول تصور یہ بھی ہے کہ اگر خدا کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا استنباط نامناسب نہ معلوم ہو تو توثیق، سکوت کے ذریعے سے بھی ہو سکتی ہے اور وحی کے ذریعے سے صراحت کے ساتھ بھی۔ یہ فوری بھی ہو سکتا ہے اور اس میں دیر بھی ہو سکتی ہے۔

اگر خدا کی طرف سے ترمیم کا کوئی حکم نہ آئے تو چاہے کتنی ہی مدت گزر جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کے مجاز ہوں گے کہ اس پر عمل کرتے رہیں کیونکہ اس کی تبدیلی کا خدا نے حکم نہیں دیا۔ پیغمبر کے استدلال و استنباط میں تبدیلی کے لیے خدا کا حکم آنا ضروری ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ایسی مثالیں ملتی ہیں مثلاً جنگِ بدر کے قیدیوں سے کیا برتاؤ کرنا چاہیے، اس بارے میں کوئی صریح حکم اس وقت تک نہیں آیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فدیہ لے کر ان کو رہا کرنے کا فیصلہ کیا تو فوراً ہی اللہ کی طرف سے یہ مشہور آیت تنبیہ نازل ہوئی:

> لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ [الانفال ۸:۶۸]
>
> اگر اللہ اس سے پہلے ہی فیصلہ نہ کر چکا ہوتا تو اس چیز کی بنا پر جو تم نے حاصل کی ہے (یعنی مال فدیہ) تمہیں سخت عذاب دیا جاتا۔

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ یہ بھی وضاحت کر دیتا ہے کہ رسول کا انسانی حیثیت میں استنباط اسے پسند نہیں آیا البتہ اس خاص صورت میں، جو میں بیان کر رہا ہوں، اس

کے متعلق خدا یہ وضاحت بھی کر دیتا ہے کہ میں پہلے ہی سے طے کر چکا تھا کہ اپنے پرانے (توریت کے) قانون کو امتِ محمدیہ کے لیے بدل دوں ۔لہٰذا اب میں محمد رسول اللہ [صلی اللہ علیہ وسلم] کے فیصلے کو قبول کرتا اور اس کی توثیق کرتا ہوں، تم اس پر عمل کر سکتے ہو۔اس کے برعکس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے استنباط کردہ حکم کی قرآن کے ذریعے سے یا وحی کے ذریعے سے فوراً تنسیخ ہوگئی تو ایسی تنسیخ کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کا اطلاق نہیں کیا جائے گا۔غرض جہاں تک اسلامی قانون کے بنیادی اساسی مآخذوں کا تعلق ہے، پہلی چیز ملک کا رسم ورواج ہے جو معقولیت کے منافی نہ ہو اور جس میں اس وقت تک قرآن وسنّت کے ذریعے سے تبدیلی نہ کی گئی ہو۔ دوسرا مآخذ قانون، وضع کردہ قانون یعنی صراحت کے ساتھ کسی قاعدے کا مقرر کرنا ہے۔ یہ قرآن کے ذریعے بھی ہو سکتا ہے اور سنّت کے ذریعے سے بھی ۔ان دونوں میں ایک اساسی فرق یہ ہے کہ قرآن اللہ کا حکم سمجھا جائے گا اور سنّت کے سلسلے میں مختلف وجوہ سے اس کا درجہ قرآن سے کمتر ہوگا ۔اگر پیغمبر کی زندگی میں پیغمبر ہی سے ہم کوئی حکم سنیں تو اس کا درجہ قرآن کے بالکل برابر ہوگا۔

مثلاً اگر عہدِ نبوی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی شخص یہ کہتا کہ یہ قرآن ہے، اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، میں اس کی تعمیل کرتا ہوں، اور یہ آپ کا انسانی حکم ہے، میں اس کی تعمیل نہیں کرتا۔ ظاہر ہے ایسے شخص کو فوراً ہی ملّت سے خارج کر دیا جائے گا۔جس وجہ سے حدیث کی حیثیت کچھ کم ہو جاتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کی تدوین وتحفظ اور ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچانے کا انتظام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نگرانی میں کرایا اور اس کے ایک ایک کو حرف اپنے حکم کے ذریعے سے امت تک پہنچایا۔ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے، اس کا زیادہ حصہ ایسا ہے جو صحابہؓ نے اپنی ذاتی صوابدید سے لکھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ صحابہؓ کی انفرادی قابلیتوں کے اختلاف کے باعث ایک صحابیؓ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی بات کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ عالم و فاضل نہیں ہے یا یہ کہ وہ اَن پڑھ ہے، بدوی ہے یا کسی کے چھینک لینے سے اس نے کوئی لفظ نہیں سنا اور کسی ایک بنیادی اور اہم لفظ کے نہ سننے سے اس حدیث کے صحیح مفہوم کو سمجھنے سے قاصر رہا۔ اگر بعد میں کوئی روایت کرتا ہے تو وہ حدیث کی صحیح روایت نہ ہوگی۔ چنانچہ قرآن جس کی تدوین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نگرانی میں کرائی اور حدیث جو صحابہؓ نے ذاتی صلاحیتوں کے مطابق انفرادی طور مرتب کی، دونوں میں فرق ہوگا۔

اس لیے بعد کے زمانے میں کسی حدیث پر عمل کرنے کے متعلق بہت سے سوالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ آیا یہ ابتدائی حکم ہے یا آخر تک یہی قانون رہا۔ شروع میں ایک حکم دینے کے بعد اسے منسوخ تو نہیں کر دیا؟ آیا یہ حکم کسی مخصوص شخص کے لیے تھا یا وہ سارے لوگوں کے لیے ہے؟ اس حدیث کو صحابیؓ نے صحیح طور پر سنا اور صحیح طور پر لکھا یا ان کی انفرادی صلاحیتوں کی وجہ سے اس میں کچھ فرق بھی پیدا ہو گیا ہے؟ صحابہؓ کے بعد تابعین کی روایات سے مختلف زمانوں میں صحتِ حدیث پر کوئی اثر تو نہیں پڑا؟ انہی وجوہ سے حدیث کا درجہ قرآن کریم سے کم تر ضرور ہے لیکن اس کا جو اصل اصول ہے وہ اوپر بیان کر چکا ہوں کہ رسول کے حکم کو صرف رسول ہی بدل سکتا ہے۔ رسول سے کمتر درجے کی شخصیت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کوئی تبدیلی کرے۔

ضمناً میں یہ بھی عرض کر دوں کہ حدیثوں کی صحت معلوم کرنے کے لیے بہت سے وسائل ہیں۔ ہمارے اسلاف نے بہت سے اصول مدوّن و مرتب کر کے ہمیں حدیثوں کے جانچنے کا معیار دیا ہے کہ کون سی حدیث قابلِ اعتماد ہے؟ اگر دو حدیثوں میں اختلاف ہے تو کس کو ترجیح دی جائے؟ واضح رہے کہ میرا یہ منشاء ہرگز نہیں کہ حدیثوں پر اعتماد نہ کیا جائے کیونکہ ''صحاح ستہ'' جیسی حدیث کی کتابوں کے متعلق ہمیں یہ اطمینان ہے کہ ان کی تدوین، انسانی حد تک، صحت کے تمام اصول و شرائط کے مطابق ہوئی ہے۔ لہٰذا حدیث

کی کم ترین درجے کی کتاب کو بھی پورے اعتماد کے ساتھ دوسری قوموں کی مستند ترین کتابوں پر ترجیح دوں گا۔

مثال کے طور پر انجیل کو لیجیے، انجیل جو آج کل چار انجیلوں کی شکل میں ہم تک پہنچی ہے، اس کے متعلق خود عیسائی مؤرخ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دنیا سے تشریف لے جانے کے تین سو سال بعد پہلی مرتبہ اس کا ذکر ملتا ہے۔ ان تین صدیوں میں نسلاً بعد نسل اس کو کس طرح نقل کیا گیا اور ایک نسل سے دوسری نسل تک کس طرح پہنچایا گیا؟ اس کا قطعاً ہمیں کوئی علم نہیں ہے۔ اس کے برخلاف حدیث کی ادنیٰ ترین کتاب میں ایک ایک سطر والی حدیث کے متعلق بھی پوری تفصیل سے حوالے (references) ملتے ہیں کہ فلاں نے فلاں سے سنا، اس نے فلاں سے، اس نے فلاں سے، اس طرح حوالوں کا یہ سلسلہ بالآخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لہٰذا اتنے حوالوں کی موجودگی میں حدیث کی ادنیٰ ترین کتاب بھی دوسری قوموں کی اعلیٰ ترین کتابوں کے مقابلے میں زیادہ بلند درجہ رکھتی ہے۔

احکام کے بارے میں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ سارے احکام یکساں درجے کا حکم نہیں رکھتے۔ بعض کی حیثیت فرض یا واجب کی ہوگی۔ بعض کا حکم سفارش اور مستحب کا ہوگا۔ بعض کی صورت حرام کی ہوگی یعنی ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ بعض کی ممانعت ایسی ہوگی کہ نہ کرو تو بہتر ہے، وہ مکروہ سمجھے جائیں گے۔ بہت سی چیزوں کے متعلق یہ حیثیت ہوگی کہ وہ ہماری صوابدید پر چھوڑی گئی ہیں یعنی مباح ہیں، چاہے تو کریں، چاہے نہ کریں۔ مگر یہ تصوّر کسی قدر دیر سے پیدا ہوا کہ علمی نقطہ نظر سے احکام کو پانچ اقسام میں تقسیم کیا جائے اور یہ تقسیم اخلاقی اساس پر ہوگی۔ جو چیز خیر ہے، اچھی ہے، بہتر ہے، اسے ضرور کرنا چاہیے۔ جو چیز شر ہے، بری ہے، اسے ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ جس چیز میں خیر غالب ہے لیکن اس میں شر کا

بھی ایک عنصر پایا جاتا ہے، اس کا کرنا بہتر ہے لیکن واجب نہیں ہوگا۔ اس کے برخلاف جس میں شر کا غلبہ ہے اگرچہ خیر کا بھی کچھ عنصر پایا جاتا ہے اس کا نہ کرنا بہتر ہے، اسے مکروہ کہا جائے گا۔ جن چیزوں میں یہ صورت نہیں ہے، نہ خیر ہے نہ شر ہے یا اس میں دونوں برابر ہیں، اس کو ہم مباح قرار دیں گے۔ یہ پنج گانہ تقسیم غالباً دوسری صدی ہجری میں شروع ہوئی اور جیسا کہ امام غزالیؒ (م ۵۰۵ ھ) نے بیان کیا ہے، یہ معتزلہ کی اصولِ فقہ کی کتابوں میں ہمیں پہلی مرتبہ ملتی ہے (۳)۔

اس سلسلے میں قطع کلام کے طور پر ایک چھوٹی سی بات عرض کروں گا کہ بھلائی اور برائی کے لیے قرآن میں دو اصطلاحیں آئی ہیں جو دلچسپ ہیں اور شاید ضرورت ہے کہ اس کی تھوڑی سی تحلیل بھی کی جائے۔ اچھی چیز کو قرآن ''معروف'' کہتا ہے اور بری چیز کو ''منکر'' کہتا ہے، **امر بالمعروف ونهی عن المنکر**۔ کہیں کہیں ''خیر'' اور ''شر'' کا لفظ بھی آیا ہے۔ لیکن عام طور پر خیر کی جگہ ''معروف'' کا لفظ اور ''شر'' کی جگہ ''منکر'' کا لفظ مستعمل ہے۔ ''معروف'' کے لفظی معنی ہیں وہ چیز جو سب لوگ جانتے ہوں اور ''منکر'' وہ چیز ہے جو بالکل نہیں جانی جاتی۔ بہت دنوں تک میں سوچتا رہا کہ یہ اصطلاح اس معنی کے لیے استعمال ہوئی؟ ہر وہ چیز جو معقول ہے جسے عقل انسانی قبول کرتی ہے اور ہر شخص اس کے بارے میں جانتا ہے کہ وہ اچھی ہے، اسی کا حکم دیا جائے گا اور جس چیز کو ہر شخص جانتا ہے کہ وہ بری ہے، اسے ممنوع قرار دیا جائے گا۔ یہ ان دونوں اصطلاحوں (معروف و منکر) کی وجہ تسمیہ ہے۔ ویسے ہمارا خالق و مالک جو حکم چاہے دے سکتا ہے۔ البتہ وہ حکیم ہے، وہ بری چیز کا کبھی حکم نہیں دیتا۔ اس کا ہر حکم حکیمانہ اور اچھا ہی ہوگا، چاہے انسان کسی حکم کی حکمت کو سمجھے یا نہ سمجھے۔

عہدِ نبوی میں کچھ اور بھی مآخذِ قانون ملتے ہیں، ان کا ذکر کرنے سے پہلے میں عرض کروں گا کہ قرآن اور حدیث ابدی مآخذِ قانون ہیں۔ چوں کہ حضرت خاتم النبیین

صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد رسالت ونبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے، لہٰذا آپ کا لایا ہوا قانون یعنی قرآنی قانون قیامت تک نافذ رہے گا۔ اسی طرح پیغمبر کے حکم کو منسوخ کرنے کے لیے ایک نئے پیغمبر کی ضرورت ہوگی۔ اس کے نہ آسکنے کی بنا پر حدیث وسنّت بھی ابدی بن جائیں گے اور قیامت تک ان پر عمل کرنا ہمارے لیے واجب ہو جائے گا۔ کتاب وسنّت میں بعض چیزیں مستحب ہیں، بعض حرام اور بعض مکروہ ہیں۔ محض امر کا صیغہ استعمال کرنے سے وہ ایک درجے میں نہیں پہنچ جاتیں۔ مثلاً قرآن مجید میں زکوٰۃ دینے کا حکم ہے جو فرض ہے اور قرآن میں اسی صیغے کے ذریعے حکم آئے گا کہ خیرات کرو، ظاہر ہے کہ یہ فرض نہیں بلکہ اس کی ترغیب دلائی جاتی ہے۔

عہدِ نبوی میں بعض اور مآخذ ہائے قوانین بھی ہمیں ملتے ہیں جو مؤقتی یا عارضی ہیں۔ ان میں سے ایک چیز وہ ہے جس کو ہم ''معاہدہ'' کا نام دیتے ہیں اور مسلمان اگر کسی معاہدے میں کچھ شرطیں قبول کرتے ہیں تو وہ شرطیں مسلمانوں کے لیے واجب التعمیل ہوں گی لیکن اس وقت تک جب تک کہ وہ معاہدہ برقرار رہے۔ جیسے ہی وہ معاہدہ ختم ہو جائے یا وہ منسوخ کر دیا جائے تو وہ شرطیں بھی جو ہمارے قانون کا جزء بن چکی تھیں، منسوخ ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح معاہدے کے ذریعے قبول کی ہوئی شرطوں کو اسلامی قانون کا عارضی اور مؤقتی جزء سمجھا جائے گا۔ اگرچہ اس کی تعمیل اتنی ہی ضروری ہے جتنی ان احکام کی جو ابدی طور پر قیامت تک کے لیے قرآن وحدیث میں دیئے گئے ہیں۔ اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ صلح حدیبیہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شرط منظور فرمائی تھی کہ اگر کوئی مسلمان مشرکین مکہ کے ہاں پناہ گزیں ہو جائے تو اس کا مسلمانوں کے سپرد یا تحویل کیا جانا مشرکین مکہ کے لیے ضروری نہیں ہوگا۔ اس کے برخلاف اگر مشرکین کا کوئی شخص مسلمان ہو کر بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پناہ کے لیے آتا ہے تو اس معاہدے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فریضہ قرار دے دیا گیا تھا کہ اس شخص کو مکے والوں کے مطالبے پر واپس

کر دیں(۴)۔ اگر چہ یہ ایک یک طرفہ کارروائی تھی لیکن جب تک وہ معاہدہ برقرار رہا، وہ اسلامی قانون کا قاعدہ جزء رہا۔ جیسے ہی وہ معاہدہ دو سال بعد ختم ہو گیا، ان حالات میں وہ قانون بھی اور وہ شرطیں بھی خود بخود ختم ہو گئیں۔

ایک اور مأخذ قانون یہ ہے کہ بعض وقت نیا قانون بنانے کی جگہ اسلامی حکومت اس چیز کو قبول کر لیتی ہے جو کسی اجنبی ملک میں رائج ہو۔ اس ضمن میں جو مثال اس وقت میرے ذہن میں ہے وہ حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانے کی ہے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بمشکل تین چار سال بعد کا واقعہ ہے۔ شام کی شمالی سرحد پر منبج نامی ایک مقام تھا۔ وہاں کے مسلمان والی نے حضرت عمرؓ کو لکھ بھیجا کہ سرحد پار کے لوگ ہمارے یہاں تجارت کے لیے آنا چاہتے ہیں، ان کے ساتھ چُنگی کے متعلق کیا برتاؤ کیا جائے؟ کس شرح اور کس مقدار سے ان سے چُنگی لی جائے؟ حضرت عمرؓ نے جواب بھیجا کہ ان تاجروں سے اسی شرح سے چُنگی لو جس شرح سے ان کے ملک میں مسلمان تاجروں سے لی جاتی ہے(۵)۔

اس قاعدے کی مزید تشریح و توضیح کرتے ہوئے امام محمد شیبانیؒ (م ۱۸۹ھ) جو امام ابو حنیفہؒ (م ۱۵۰ھ) کے شاگرد رشید تھے، اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ اس قاعدے کا اطلاق مختلف طور پر ہو سکتا ہے۔ مثلاً کسی اجنبی ملک میں اگر مسلمان تاجروں سے کوئی چُنگی نہیں لی جاتی تو ہم بھی اس ملک کے تاجروں سے کوئی چُنگی نہیں لیں گے۔ مماثلت (reciprocity) کا قاعدہ اس وقت تک اپنی جگہ برقرار رہے گا جب تک ہماری حکومت اس کے خلاف فیصلہ صادر نہ کرے۔

ان مآخذ ہائے قانون کے بعد قابل ذکر چیز وہ ہے جس کے باعث اسلامی قانون ساز کو ایک ایسا وسیلہ حاصل ہو گیا جس سے اسلامی قانون قیامت تک زندہ رہ سکے اور ہر آنے والی نئی ضرورت سے سربراہ ہو سکے، یہ اجتہاد ہے۔ ہمارے فقہاء جو چار

اصول بیان کرتے ہیں: قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس، ان میں اجماع عہدِ نبوی میں نہیں پایا جاتا تھا۔ قیاس جس کو ہم یہاں اجتہاد کا نام دے رہے ہیں وہ عہدِ نبوی میں وجود میں آ چکا تھا۔ یہ عہدِ نبوی کے آخری زمانے کا واقعہ ہے، ۹ ہجری یعنی وفات سے سال ڈیڑھ سال پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ حکم دیا تھا اور جن حالات میں وہ حکم دیا تھا ان کی تفصیل یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کے علاقے میں ایک صحابیؓ کو قاضی بنا کر روانہ کیا ان کا نام حضرت معاذ بن جبلؓ تھا۔ اس زمانے کا قاعدہ تھا کہ اگر کوئی شخص کسی عہدے پر مامور کر دیا جائے تو جانے سے پہلے آخری باریابی اور آخری ملاقات کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوتا اور آپ اسے آخری ہدایات دیتے تھے۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبلؓ سے پوچھا: **بم تحکم؟** (تم حکم کس اساس پر دیا کرو گے)۔ ان کا جواب تھا: **بکتاب اللہ** (اللہ کی کتاب یعنی قرآن کے مطابق)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **فان لم تجد؟** (اگر اس میں نہ پاؤ تو کیا کرو گے؟)۔ حضرت معاذ بن جبلؓ نے فوراً کہا: **فبسنۃ رسول اللہ** یعنی رسول اللہ کی سنت کے مطابق۔ اس جواب کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول کیا، لیکن پھر فرماتے ہیں کہ اگر تمہیں سنت میں بھی کوئی چیز نہ ملے تو کیا کرو گے؟ تو حضرت معاذ بن جبلؓ کے الفاظ یہ تھے: **اجتهد برائی ولا آلو جهدا**، میں اپنی رائے کے ذریعے سے (حل تلاش کرنے کی) کوشش کروں گا اور اس میں کوتاہی نہیں کروں گا۔

دوسرے الفاظ میں اپنی صوابدید سے غور کر کے، استدلال کر کے، استنباط کر کے، قیاس کر کے حکم دوں گا اور ایسی چیز معلوم کرنے کی کوشش کروں گا جو میری دانست میں اللہ کو پسند ہو، معقول ہو اور عدل وانصاف کے مطابق ہو۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر خوش ہوئے کہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہتے ہیں: اے اللہ! تو نے اپنے رسول کے رسول کو جس چیز کی توفیق دی ہے، اس پر تیرا رسول خوش ہے(٦)۔

چنانچہ قرآن و حدیث میں سکوت کی صورت میں یا اس میں قانون نہ ملنے کی صورت میں ہمیں اجتہاد کی اجازت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اختیار بہت ہی محدود ہے۔ اگر قرآن و حدیث میں صراحت موجود ہے تو اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ اسی وقت اجتہاد کر سکیں گے جب کہ قرآن و حدیث میں باوجود تلاش کے کوئی قاعدہ اور کوئی حکم پیشِ نظر مسئلے سے متعلق نہ ملتا ہو۔

اجتہاد کے ذریعے سے قانون دریافت کرنے کی بھی مختلف صورتیں ہیں۔ کبھی یوں ہوتا ہے کہ خاص اس چیز کے لیے تو حکم نہیں ہے لیکن ایک مماثل چیز کے لیے حکم ملتا ہے۔ فرض کیجیے کہ چوری کا قانون موجود ہے لیکن کفن چوری کا ذکر قرآن میں نہیں ہے کہ کیا کریں؟ اب ہمارا مجتہد قیاس کرے گا۔ چونکہ ایک قِسم کی چوری کے لیے حکم ہے، اس لیے ایک دوسری قِسم کی چوری میں بھی ہم اس قِسم کا استدلال کر سکتے ہیں یا اس میں کسی قدر ترمیم کے ساتھ حکم دے سکتے ہیں۔ اسی طرح اور مسائل کے متعلق بھی بعض وقت مماثلتیں ڈھونڈی جاتی ہیں۔

ایک دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ بظاہر تو منطقی استدلال کے ذریعے ہم ایک چیز کا حکم دے سکتے ہیں لیکن اگر ذرا غور کریں تو فوری طور پر ذہن میں آنے والا طریقہ مناسب نہیں ہوتا بلکہ ایک عمیق تر وجہ سے کوئی دوسرا ہی قانون مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس کو استحسان کہتے ہیں کیونکہ ایک عمیق تر وجہ کے باعث ہم ایک دوسرے طریقے یا قانون کو بہتر اور مستحسن سمجھتے ہیں۔ کبھی ایک اور اصول پیشِ نظر ہوتا ہے، وہ یہ کہ امت کا فائدہ اس میں ہے۔ بہت ہی سخت قسم کی منطق سے تو یہ قاعدہ ہونا چاہیے لیکن امت کی فلاح، امت کی بہبودی اور آسانی کے لیے یہ دوسرا قاعدہ بہتر معلوم ہوتا ہے اس کے لیے استصلاح کا نام دیتے ہیں۔ اس طرح کے مختلف لطیف فرق کے ساتھ اجتہاد کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ اس کا رواج ہمیں عہدِ نبوی سے ملنے لگتا ہے۔ اس قاعدے کے اطلاق کے باعث، خاص

طور پر قاضیوں کے فیصلوں کے سلسلے میں ہمیں ایک نئی چیز سے سابقہ پڑا ہے جو قانون سازی کا ایک جزو ہے۔ فرض کیجیے کہ قرآن وحدیث میں کوئی قاعدہ نہیں ملتا اور قاضی ایک اجتہاد کر کے فیصلہ دیتا ہے۔ چونکہ وہ قاضی ہے، اس لیے وہ اپنے فیصلے کا نفاذ بھی کرا سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ لیکن ممکن ہے کہ نفاذ سے پہلے خود قاضی کو شبہ ہو۔ وہ مرکز سے دریافت کرے گا۔ مرکز سے جواب دیا جائے گا جو سنت ہونے کے باعث قانون کی صورت اختیار کرے گا۔ اس کا تعلق اجتہاد سے نہیں رہے گا۔ ایک اور صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ قاضی نے فیصلہ کر دیا اور اس سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کرنا ضروری نہیں سمجھا لیکن اس فیصلے کی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نامہ نگاروں کے ذریعے پائی۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی نہ کسی ذریعے سے پہنچی یا یہ کہ فریق مقدمہ نے اپیل کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نامہ نگاروں کے ذریعے سے اطلاع پائی۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس فیصلے کو نامناسب سمجھتے ہیں تو نظم ونسق کے افسر اعلیٰ یا حکمران کی حیثیت سے نہیں بلکہ قانون ساز کی حیثیت سے فوراً اس گورنر یا قاضی کو ہدایت دیں گے کہ یوں نہیں یوں کرو۔ ایسی مثالیں متعدد ملتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف گورنروں کو ایسی ہدایتیں بھیجیں۔

ایک مثال یہ ہے کہ ایک شخص کو قتل کر دیا گیا تھا۔ قتل خطا کے طور پر تھا اور اس کا خون بہا دلایا گیا۔ پرانے رواج کے مطابق خون بہا متوفی کے سب وارثوں کو نہیں بلکہ صرف مرد وارثوں کو دلایا گیا۔ اس کی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ ہدایت بھیجتے ہیں کہ فلاں شخص کے خون بہا میں سے اس کی بیوہ کو بھی حصہ دلایا جائے(۷)۔ خون بہا کو وراثت کا جزو قرار دیا گیا۔ وراثت کی صورت میں بیوی کے، بیٹے کے، بیٹی کے، ماں باپ وغیرہ ہر ایک وارث کے قرآن مین حصے مقرر کیے جا چکے ہیں(۸)، اس لیے

خون بہا میں بھی اسی قاعدے کا لحاظ رکھنا ہوگا۔ ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ قانون سازی کس طرح اس زمانے میں عمل میں آیا کرتی تھی۔

اجماع کا قاعدہ عہدِ نبوی میں ناممکن تھا، وہ بعد کی چیز ہے۔ اجماع کے معنی ہوتے ہیں کہ قرآن وحدیث میں اگر ہمیں کسی مسئلے کا حل نہیں ملتا تو ہم اس بارے میں قیاس واجتہاد سے کام لیتے ہیں اور اس اجتہاد پر اس زمانے کے سارے ہی علماء متفق ہو جاتے ہیں۔ ایسے قانون کو جس پر سب علماء متفق ہو جائیں، لازماً زیادہ قابل قبول قرار دینا پڑتا ہے۔ اجماع کو ہم ایک خاص اہمیت ضرور دیتے ہیں لیکن کم از کم حنفی فقہاء کے نزدیک اجماع اٹل اور ناقابل تبدیل نہیں ہے، بلکہ ایک جدید تر اجماع کے ذریعے ایک قدیم تر اجماع کو منسوخ کیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح ایک فقیہ کی رائے کو دوسرا فقیہ رد کر کے اپنی علیحدہ رائے دے سکتا ہے۔ بنابریں اگر ایک قدیم اجماع کے بعد اس کی برعکس بات پر دوسرا جدید اجماع قائم ہو جائے تو وہ پہلے اجماع ہی کی طرح واجب التعمیل ہو جائے گا اور پرانا اجماع باقی نہیں رہے گا۔ یہ رائے ممتاز حنفی امام ابوالیسر بزدویؒ (م ۴۸۲ ھ) کی ہے۔ اصول فقہ پر ان کی مشہور کتاب میں ان کے الفاظ یہی ہیں کہ جدید تر اجماع کے ذریعے سے قدیم تر اجماع منسوخ کیا جاسکتا ہے(۹)۔ امام رازیؒ (م ۶۰۶ ھ) کی بھی یہی رائے ہے(۱۰)۔ یہ اسلامی قانون کی ایک بہت بڑی خدمت تھی۔ چونکہ اجماع سے بنا ہوا قانون خدا اور رسول کی طرف سے آیا ہوا اٹل قانون نہیں بلکہ انسانی رائے پر مبنی ہوتا ہے، اس لیے اس کے ہمیشہ کے لیے پابند نہ ہو جائیں۔ بدلنے والے حالات کے تحت بدلنے والی ضرورتوں کے تحت ہم ایک انسان کے قانون کو دوسرے انسان کے قانون کے ذریعے بدل سکیں۔ ظاہر ہے کہ عام طور پر ہم یہی کہیں گے کہ اجماع کے خلاف زبان کھولنے کی جرأت نہیں کی جاسکتی لیکن اس قاعدے کے تحت جو امام بزدویؒ نے بیان کیا ہے، اولاً کسی نہ کسی کو پرانے

اجماع کے خلاف زبان کھولنی اور پرانی رائے پر اعتراض کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ پھر بعد میں معاصر فقہاء اس کی رائے کو قبول کرتے جائیں گے۔ جب سارے لوگ اس پر متفق ہو جائیں گے تو پرانا اجماع ختم ہو جائے گا۔

اب اپنے موضوع کے دوسرے جزو پر توجہ کرتا ہوں جو عدل گستری کے متعلق ہے۔ عہدِ نبوی کی عدل گستری کی اہمیت اور اس زمانے کے اصلاحات کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عدل گستری کا کیا نظام تھا؟ اس کے بعد ہم دیکھیں گے کہ عہدِ نبوی میں کیا انقلاب آیا، کیا کایا پلٹ ہوگئی اور اس کی کتنی بڑی اہمیت ہے؟ زمانہ جاہلیت میں عرب کے بدوی قبائل میں کوئی حکمران، کوئی حکومت نہ تھی اور کوئی عدالت بھی نہیں ہوا کرتی تھی۔ لہٰذا کسی شخص کو انصاف حاصل کرنے کے لیے کسی کے پاس جا کر شکایت کرنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ مظلوم کیا کرے ''دست خود دھان خود'' ہر شخص اپنی بساط کے مطابق اپنے ظالم سے بدلہ لے گا۔ اگر ظالم کمزور ہو تو بدلہ آسان تھا لیکن اگر ظالم قوی تر ہو تو کمزور کے لیے کوئی امکان نہیں کہ وہ انصاف حاصل کر سکے۔ اس صورت حال میں کہیں کہیں ہمیں بہت ہی مدھم روشنی بھی نظر آتی ہے، وہ یہ کہ اگر ظالم منظور کرے تو کوئی خاطر مدار شخص ان دو آدمیوں کے جھگڑے کو چکائے گا۔ ایسی صورت میں اس پنچ یا ثالث کو ایک طرح کا عارضی حاکم عدالت بنا لیا جاتا تھا اور اس کے فیصلے پر فریقین عمل کرتے۔

اس کی کچھ مثالیں زمانہ جاہلیت میں ہمیں ملتی ہیں۔ طائف کے قریب عکاظ میں ایک میلہ لگا کرتا تھا جس میں بیرونی ممالک سے بھی لوگ آیا کرتے تھے۔ اس میلے کے لیے ایسے حکم مقرر کیے جاتے تھے جو دو تین دن کے لیے عارضی طور پر ہوتے تھے۔ جب تک میلہ لگا رہتا، اس وقت تک ان کی حیثیت حکم کی ہوتی۔ میلے میں جتنے تجارتی جھگڑے پیش آتے، ان کی طرف رجوع کیے جاتے اور وہ فیصلے دیتے تھے۔ ہر شخص جانتا

تھا کہ کون حکم ہے۔ اس لیے لوگ اگر آپس میں طے کر چکے ہوں کہ اپنے مقدمے کا فیصلہ حکم سے کرائیں گے تو وہ میلے کا انتظار کرتے، میلے کے حکم کے پاس جاتے، اس کو اپنا قصہ سنا کر فیصلہ کراتے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ عرب میں اس اندھیر نگری کے اندر بھی کہیں کہیں کچھ روشنی کی مثالیں ملتی ہیں۔ جہاں تک مکے کا تعلق ہے تو ہمیں وہاں شہر کے باشندوں کے جھگڑوں کو چکانے کے لیے تین چیزیں نظر آتی ہیں:

۱۔ ایک دیوانی عدالت جس کے حاکم عدالت خود حضرت ابو بکرؓ تھے،

۲۔ دوسری فوجداری عدالت،

۳۔ ان دونوں کے علاوہ ایک اور ادارہ وہاں پایا جاتا تھا جسے ''حلف الفضول'' کا نام دیا گیا ہے۔ یہ Order of Chivalry کی صورت تھی۔ مکے والوں نے ایک زمانے میں یہ محسوس کیا تھا کہ ہمارے شہر میں بعض وقت اجنبیوں پر بے وجہ ظلم ہوتا ہے جس سے شہر بھر کی بدنامی ہوتی ہے۔ چنانچہ واقعتاً ابو جہل کی وجہ سے ایک شخص نے ایک نظم کہی جس میں مکہ والوں کی ہجو کی۔ ابو جہل نے تو کوئی پرواہ نہ کی لیکن دوسرے اہل مکہ کو چوٹ لگی۔ ان حالات میں انہوں نے آپس میں جمع ہو کر معاہدہ کیا کہ ہم میں سے کم از کم چند لوگوں کو چاہیے کہ رضا کارانہ طور پر اس بات کا اقرار کریں کہ جب کبھی ہمارے شہر کے اندر کسی اہل مکہ یا کسی اجنبی پر اگر کوئی ظلم ہو تو ہم مظلوم کی مدد کریں گے اور اس وقت تک چین نہیں لیں گے جب تک کہ اسے اس کا حق نہ دلا یا جائے (۱۱)۔

جہاں تک مدینہ کا تعلق ہے تو وہاں سوائے اس کے امکان نہ تھا کہ ہر شخص اپنی مدد آپ کرے۔ ان حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لانے کے بعد جب شہری مملکت قائم ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا دستور مدوّن فرمایا اور دنیا کا یہ پہلا دستور تحریری طور پر منضبط کر کے نافذ بھی کیا (۱۲)۔ اس میں ایک عجیب و

غریب حکم دیا گیا جسے انقلابی نوعیت کا کہا جا سکتا ہے۔ وہ یہ کہ انصاف بجائے انفرادی کے مرکزی شے ہوگی۔ یعنی اگر کسی کو نقصان پہنچا ہے تو وہ براہ راست مجرم کو سزا نہیں دے سکے گا بلکہ مرکزی عدالت سے رجوع کرے گا۔ حاکم عدالت حالات سن کر بغیر رعایت کے پوری غیر جانبداری کے ساتھ مقدمے کا فیصلہ کرے گا اور ظالم کو سزا دے کر مظلوم کو اس کا حق دلائے گا۔ اس کے بارے میں کچھ دفعات اور بھی ہیں، وہ یہ کہ کسی شخص کو ظالم کی حمایت کرنے کا حق نہیں ہوگا چاہے اس کا اپنا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ فرض کیجیے کہ میرے بیٹے نے کسی کو قتل کر دیا ہو تو باوجود باپ ہونے کے مجھے یہ حق نہیں ہے کہ میں اپنے بیٹے کی حمایت کروں اور پولیس کی طرف سے اس کی گرفتاری کے وقت مدافعت کروں۔ اس کے برخلاف یہ کہا گیا ہے کہ انصاف ایک خدائی حکم ہے، لہٰذا ہر شخص کو چاہیے کہ انصاف کے لیے پورا تعاون کرے اور کسی ظالم کو نہ بچائے، چاہے وہ اس کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

ان حالات میں ہم دیکھتے ہیں کہ مدینے کی حد تک ایک انقلابی حکم دیا گیا اور انصاف جو وہاں انفرادی کام تھا اس کو ایک مرکزی اور حکومتی چیز قرار دیا گیا۔ اس کے بعد ہمیں مدینے میں دو نئے ادارے ''انسٹی ٹیوشن'' قائم ہوتے اور ترقی کرتے نظر آتے ہیں جو بعد میں سارے ملک میں پھیل جاتے ہیں: ایک مفتی کا انسٹی ٹیوشن ہے اور دوسرا قاضی کا۔ مفتی کا مطلب یہ ہے کہ وہ فتویٰ دے یعنی ہم اس سے قانون معلوم کریں، قانون کے نفاذ کی ذمہ داری اس کے فرائض میں داخل نہیں ہے۔

دوسرا ادارہ قاضی کا ہے۔ عہدِ نبوی میں ہمیں قاضی بہت سے ملیں گے لیکن شہر مدینہ میں مستقل قاضی کا پتا کم از کم مجھے نہیں ملتا۔ البتہ مثالیں متعدد ملتی ہیں کہ عارضی طور پر کسی ایک مقدمے کا فیصلہ کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی صحابیؓ کو نامزد کرتے اور کہتے کہ فریقین کے بیانات کو سن کر یا برسرِ موقع جا کر، حالات کو دیکھ کر فیصلہ کرو۔ گویا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا فیصلہ ہوتا تھا کہ آپ کے نمائندے اور مقرر

کردہ نائب نے وہ فیصلہ کیا تھا۔

اس سلسلے میں ایک چھوٹا سا دلچسپ واقعہ جو خاصی اہمیت کا حامل ہے وہ حضرت عمرو بن العاصؓ کا ہے جو مہاجرین میں بہت ذہین تھے اور قانونی نقطہ نظر سے ان کی مہارت بے انتہا تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا کہ فلاں مقدمے میں تم فیصلہ کرو۔ وہ پوچھتے ہیں ''لیکن کس اساس پر''؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مفہوم کو سمجھ کر جواب دیتے ہیں کہ اگر تم صحیح نتیجے پر پہنچو گے تو تمہیں انصاف رسانی اور حق وعدل کی بنا پر دو ثواب ملیں گے۔ اس کے برخلاف اگر تم صحیح نتیجے پر نہ پہنچو تو اگر نا انصافی ارادتاً نہیں بلکہ اتفاقاً ہوئی ہو تو تمہاری حسن نیت کی وجہ سے تم کو ایک ثواب ضرور ملے گا کہ تم نے انصاف کرنا چاہا تھا(۱۳)۔ ان حالات میں ہم دیکھتے ہیں کہ قاضیوں کی آراء میں اختلاف ہوتا تھا۔ اس کا آغاز عہدِ نبوی ہی سے شروع ہو جاتا ہے اور بعد کے زمانے میں بڑھتا جاتا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ (م ۱۵۰ھ) نے اپنے زمانے میں اسلامی قانون کو مدوّن کرنے کی جو کوشش کی تھی اور چالیس ممبروں کی ایک اکیڈمی بنائی تھی جس نے اسلامی قانون کو مدوّن کیا، اس کی وجہ اور اس کا باعث یہی تھا کہ مختلف قاضیوں کے فیصلے میں تضاد ہوتا تھا۔ ایک ہی قسم کا مقدمہ ہو تو ایک قاضی ''الف'' فیصلہ کرتا ہے اور دوسرا قاضی اس کے بالکل برعکس ''ب'' فیصلہ کرتا ہے۔ چنانچہ ایک کتاب جس کا نام رسالة الصحابة ہے، اور یہ ابن المقفعؒ (م ۱۴۳ھ) کا ایک خط ہے جو اس نے اپنے ہم عصر خلیفہ منصورؒ (م ۱۵۸ھ) کے نام لکھا تھا اور اس میں وہ تفصیل سے بیان کرتا ہے:

''امیر المومنین! ہمارے زمانے میں قاضیوں کے فیصلوں میں اختلاف کے باعث بے انتہا دشواریاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ایک ہی مسئلے پر دو قاضی مختلف فیصلہ کرتے ہیں۔ ایک قاضی کے مطابق سزائے موت دینی چاہیے، دوسرے کے مطابق اس قسم کے مقدمے

میں سزائے موت نہیں دینی چاہیے۔ اسی طرح ایک اور مقدمے میں ایک قاضی کی رائے کے مطابق ایک خاص صورت میں طلاق پڑ چکی ہے۔ دوسرا قاضی کہتا ہے کہ طلاق نہیں ہوئی۔ غرض ہماری عزت و آبرو غیر محفوظ ہو چکی ہے۔ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ حق کیا ہے؟''

ایسی مثالیں دے کر وہ ایک تجویز پیش کرتا ہے جو میری دانست میں نامناسب تھی اور خلیفہ منصورؒ نے بھی اسے رد کر دیا۔ اگرچہ بظاہر وہ معقول نظر آئے گی۔ اس نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ امیر المومنین سارے قاضیوں کے پاس احکام بھیجیں کہ اپنے فیصلوں کی نقلیں خلیفہ کے پاس اپنی اپنی دلیلوں کے ساتھ روانہ کیا کریں۔ اگر امیر المومنین کو اس میں کوئی نامناسب چیز نظر آئے تو وہ خود حکم دیں اور ہمیں اختلافی نظائر سے نجات مل جائے گی۔ کسی مسئلے میں اختلاف رائے ہو یا دو مختلف نظریے موجود ہوں اور قاضی کو معلوم نہ ہو سکے کہ کیا کرنا چاہیے تو وہ صرف اپنی صوابدید کی بجائے امیر المومنین کے احکام کی تعمیل کر سکے گا اور اس طرح سارے ملک میں قانون ہر وقت یکساں رہے گا۔

لیکن خلیفہ نے نہ صرف اس تجویز کو رد کر دیا بلکہ معلوم نہیں اس بنا پر یا کسی اور وجہ سے ابن المقفعؒ کے قتل کرنے کا حکم صادر کر دیا اور اسے سزائے موت دے دی گئی۔

بہر حال میں نے آپ سے ایک قیاس ظاہر کیا تھا کہ اسلام میں ایک طرز روش (Tradition) یہ رہی ہے کہ عہدِ نبوی سے لے کر آج تک عدالت کی طرح قانون سازی بھی حکومت اور سیاست کے تحت نہیں رہی۔ اگر خلیفہ منصورؒ اس تجویز کو قبول کر لیتا تو اس کے بعد قانون سازی سیاست اور خلیفہ کے احکام کے تابع ہو جاتی۔ خلیفہ اچھے بھی آتے ہیں اور برے بھی، اس طرح آئے دن قانون بدلتے رہتے۔ ایک پرانے قانون کو نیا خلیفہ منسوخ کر دیتا۔ لیکن اگر اسلامی قانون، حکومت اور سیاست کے عمل دخل سے آزاد رہے تو تمام فقہاء مساوی درجہ رکھنے کے باعث ایک دوسرے پر اعتراض کر سکیں گے اور اس طرح قانون صحیح تر بھی رہے گا اور ترقی پذیر بھی۔

یہ تھیں وہ چند باتیں، جن سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ نبوی میں قانون سازی کا کیا طریقہ اور عدل گستری کا کیا قاعدہ تھا۔ عہدِ نبوی میں صوبہ جات واضلاع مثلاً یمن میں قاضی بھیجے جاتے اور ان کے متعلق بعض تفصیلیں مثلاً حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو جب قاضی بنایا گیا تھا تو ان کا تقرر نامہ ہم تک پہنچا ہے۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں تمہیں فلاں غرض کے لیے مامور کرتا ہوں، تم اس طرح سے اپنے فرائض انجام دیا کرنا(۱۴)۔ اسی طرح بعض اور قاضیوں کے متعلق بھی احکامات ملتے ہیں۔ یوں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس ابتدائی زمانے میں صفر سے شروع ہو کر اسلامی محکمہ قانون سازی اور اسلامی محکمہ عدل گستری کس طرح وجود میں آتے ہیں اور کس طرح بعد کی ضرورتوں کو وہ پورا کرتے ہیں، جب کہ اسلامی مملکت ایک شہر کے ایک جزو میں پائی جانے والی مملکت مدینہ ہی پر نہیں بلکہ تین براعظموں میں پھیل جاتی ہے۔

حواشی

۱۔ ربیع الأول ۴ ہجری

۲۔ ملاحظہ ہو: بغوی، ابومحمد الحسین بن مسعود الفراء (م ۵۱۶ھ)، **تفسیر البغوی المسمی معالم التنزیل**، ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان ۶۲/۲

۳۔ ملاحظہ ہو: غزالی، ابوحامد محمد بن محمد (م ۵۰۵ھ)، **المستصفیٰ من علم الأصول، القطب الأول فی الثمرة و هی الحکم، الفن الأول فی حقیقته**، جزءاوّل، منشورات الشریف الرضی، قم

۴۔ تفصیل ملاحظہ ہو: ابن ہشام، ابومحمد عبدالملک بن ہشام (م ۲۱۸ھ)، **السیرة النبویة**، داراحیاء التراث العربی، بیروت لبنان ۳۴۶/۳

۵۔ تفصیل ملاحظہ ہو: بیہقی، ابوبکر احمد بن الحسین بن علی (م ۴۵۸ھ)، السنن الکبریٰ، کتاب الجزیة، جماع ابواب الشرائط التی یأخذها الامام علی اهل الذمة، باب ما یؤخذ من الذمی اذا اتجر فی غیر بلده و الحربی اذا دخل بلاد، دارالفکر، بیروت لبنان ۱۴۱۶ھ/۱۹۹۶م، ۱۴/۶۳، ۶۴

۶۔ ترمذی، محمد بن عیسیٰ (م ۲۷۹ھ)، الجامع، کتاب الاحکام، باب ماجاء فی القاضی یصیب و یخطی

۷۔ ابن الطلاع، ابوعبداللہ محمد بن فرج مالکی (م ۴۹۸ھ)، اقضیة الرسول صلی الله علیه وسلم، کتاب الفرائض والعتق، حکم رسول الله فی میراث الدیة، دارالکتاب اللبنانی ۱۹۸۲م، ص ۶۸۰

۸۔ النساء ۴: ۱۱، ۱۲، ۱۷۶

۹۔ عبدالعزیز بخاری (م ۷۳۰ھ)، کشف الاسرار علی اصول فخر الاسلام البزدوی، دارالکتب العلمیة، بیروت لبنان ۱۴۱۸ھ/۱۹۹۷م، ۳/۳۸۶، ۳۸۷

۱۰۔ رازی، فخرالدین محمد بن عمر (م ۶۰۶ھ)، المحصول فی اصول الفقه، مکتبة نزار مصطفی الباز ۱۴۱۷ھ/۱۹۸۷م، ۳/۸۹۱

۱۱۔ حلف الفضول کی تفصیل ملاحظہ ہو: ابن ہشام، السیرة النبویة ۱/۱۷۰

۱۲۔ یہ تحریری معاہدہ مہاجرین، انصار اور یہود کے درمیان ہوا تھا۔ تفصیل ملاحظہ ہو: ابن ہشام، السیرة النبویة ۳/۱۱۵

۱۳۔ امام حاکم اور امام دارقطنی نے اس واقعہ کی جو احادیث روایت کی ہیں ان کے مطابق مجتہد کو فیصلہ میں صائب ہونے پر دس اور خطا پر ایک اجر کی خوشخبری

دی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو: حاکم نیشاپوری (م ۴۰۵ھ)، المستدرک علی الصحیحین، کتاب الاحکام، دارالکتاب العربی، بیروت لبنان ۴/ ۸۸۔ دارقطنی، علی بن عمر (م ۳۸۵ھ)، سنن الدارقطنی، کتاب فی الأقضیة و الأحکام و غیر ذلک، دارالمعرفة، بیروت لبنان، طبع اوّل ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱م ۳/ ۴۴۲، ۴۴۳

۱۴۔ بخاری، محمد بن اسماعیل (م ۲۵۶ھ)، صحیح البخاری، کتاب الاحکام، باب امر الوالی اذا وجّه أمرین إلی مواضع أن یتطاوعا و لا یتعاصیا، داراحیاء التراث العربی، بیروت لبنان، طبع اوّل ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱م، ص ۱۲۶۷
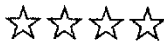
جسٹس شیخ عبدالحمید

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت قانون داں

اگرچہ زمانہ تخلیق کو ناپنے کا کوئی آلہ موجود نہیں ہے تاہم سائنس دانوں کی قیاس آرائی کے مطابق انسان کو اپنی موجودہ شکل وصورت میں اس کرۂ ارض پر وجود میں آئے تقریباً دس ہزار سال گزرے ہیں۔ وہ شروع دن سے خوراک و مکان کی تلاش میں صحرانوردی کی زندگی بسر کرتا رہا اور جب بھی اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ حائل ہوئی اس نے انسانی خون بہانے سے اعراض نہیں کیا۔ اس صورت حال کا ذکر قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کے مابین مکالمے کے انداز میں موجود ہے۔ جب فرشتوں کو اس کا علم ہوا کہ وہ انسان کو تخلیق کرنے کا ارادہ کر رہا ہے تو انہوں نے دریافت کیا: اے رب العالمین! کیا تو ایک ایسی ہستی کو پیدا کرنا چاہتا ہے جو کرۂ ارض پر ہر روز ایک نیا ہنگامہ کھڑا کرے گی اور خون بہانے سے باز نہیں آئے گی۔ فرشتوں کی پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ زمین پر قدم رکھتے ہی انسان نے اشیائے خوراک اور عورت کے لیے خون بہانا شروع کر دیا اور آج تک وہ اسی راہ پر گامزن ہے۔

اس وقت کوئی سیاسی ادارہ ایسا نہ تھا کہ جو معاشرے میں امن و عافیت، نظم ونسق قائم رکھتا اور دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ زنی اور خلاف ورزیوں کو دیکھ کر ان کی روک تھام کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کام اپنے پیغمبروں کے سپرد کر دیا جن کو وہ وقتاً فوقتاً زمین پر بھیجتا رہا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جو دنیا کے سب سے بڑے قانون ساز تھے، آسمانی احکام لے

کر آئے جن کی رو سے قتل وغارت گری، چوری اور بدکاری کو ممنوع قرار دیا گیا۔ ان کے بعد دوسرے پیغمبر اعلیٰ خیالات کی تبلیغ کرنے آئے اور سب سے آخر میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔ چوں کہ اللہ کے پیغامات انسانوں تک پہنچانے کے لیے وہ آخری نبی تھے اور چوں کہ آپ کے پیغامات اور قوانین کو ہر زمانے اور ہر مقام کے لیے مفید اور کارآمد بنانا تھا، اس لیے آپ کے دائرہ عمل کو بھی ان کے پیش روؤں کے مقابلے میں وسیع تر رکھنا تھا۔ لہٰذا وہ زمان ومکاں کی بندشوں سے قطع نظر انسانی زندگی کے تقریباً سب ہی پہلوؤں پر اثر انداز رہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ضابطہ قانون ایک مکمل دستاویز بن گیا۔ آپ نے وحی الٰہی کے زیرِ ہدایت جن اصول وفروع کو بیان فرمایا ان کی حیثیت مستقل اور دائمی ہے، البتہ جن امور کے بارے میں شریعت خاموش ہے ان میں اصولِ دین اور روحِ شریعت کی مطابقت میں اجتہادی آراء پیش کی جاسکتی ہیں۔

دین اسلام کو قوانین واخلاقیات کے ایسے بنیادی اصول وضع کرنے تھے جو وقتاً فوقتاً اور جگہ جگہ تفصیلات سے متعلق قاعدے مرتب کرانے میں مدد دیتے اور جو احکامات درج ہیں ان سے مسلمان قانون سازوں نے پانچ اصول اخذ کیے جو آئین کے سو پہلوؤں پر حاوی ہیں۔ اسلام میں آئین سازی کا مقصد یہی ہے کہ ان اصولوں کی تعمیل کرائی جا سکے، ان اصولوں کو شرع میں ''کلیاتِ خمسہ'' کہا جاتا ہے جو مختصراً یہ ہیں:

۱۔ دین کا تحفظ

۲۔ زندگی کا تحفظ

۳۔ جائیداد کا تحفظ

۴۔ وراثت کا تحفظ (نسل کا تحفظ)

۵۔ فکر واستدلال کا تحفظ (عقل کا تحفظ)

مسلمان آئین سازوں کے حساب کے مطابق قرآن پاک میں دو سو ستائیس

آیات، گیارہ قانونی معاملات مثلاً شادی، جہیز، طلاق، تحائف، وصیت، خرید وفروخت، سرپرستی، کفالت اور ارتکاب جرم سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اس بدلتی ہوئی اور ترقی پذیر دنیا کے لیے صرف یہ شقیں کافی نہیں کہی جاسکتیں۔ لہٰذا قرآن پاک نے مختلف النوع حالات کے لیے قوانین مرتب نہیں کیے جو مختلف زمانوں اور مختلف مقامات پر پیش آسکتے تھے۔ یہ بات آنے والے دور کے قانون سازوں کے لیے چھوڑ دی گئی تاکہ وہ بنیادی اصولوں کی روشنی میں تقاضائے وقت اور حالات کو دیکھتے ہوئے دوسرے قوانین مرتب کرلیں، بشرطیکہ وہ دوسرے قرآنی احکام کے عین مطابق ہوں۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کے اوّلین قانون ساز تھے۔ آپ نے اس ضمن میں مسلمانوں کی رہنمائی کی۔ آپ نے اپنے زمانے کے تقاضوں کا خیال رکھا۔ آپ کے قانونی ملفوظات دوسرے تشریعی قوانین کا ذریعہ بن گئے جن پر تمام اسلامی آئین کی بنیادیں قائم ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ احکام بھی نافذ ہیں کہ تمام مسلمان فرمانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کریں۔ قرآن پاک میں آیا ہے:

وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا

[الحشر ۵۹:۷]

جو کچھ رسول تم کو دے اسے مضبوطی سے پکڑے رہو اور جس سے وہ تمھیں منع کرے اسے ترک کردو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد یہ بھی ہے:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ [النساء ۴:۸۰]

جس نے رسول کی اطاعت کی، فی الحقیقت اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

اسی لیے کہا جاتا ہے اور یہ کہنا صحیح بھی ہے کہ کوئی مملکت اسلامی نہیں کہی جاسکتی اگر اس کے قوانین قرآن وسنّت سے متضاد ہوں۔ سنّت سے مراد ہر وہ بات ہے جو نبی

صلی اللہ علیہ وسلم نے کہی، ہر وہ فعل ہے جو آپ نے کیا اور وہ رائے بھی جو دوسروں کے بارے میں قائم کی گئی۔

اس مقالے میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آئین ساز وقانون ساز کی حیثیت میں کیا کردار ادا کیا ہے۔ آپ نے جو بھی کردار ادا کیا، وہ ہر زمانے اور مقام کے باشندوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ جہاں کہیں بھی اسلامی آئین نافذ کرنا مطلوب ہو وہ لازمی طور قرآنی احکام اور سنّت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کے عین مطابق ہونا چاہیے۔

خرید وفروخت اور معاہدے

عام قانون کے جتنے بھی مہذب نظام دنیا میں رائج ہیں ان سب میں معاہدے کا سب سے اہم عنصر ''رضا مندی'' ہوتا ہے جو زیرِ معاہدہ لین دین سے ظہور میں آنے والے نفع ونقصان کا صحیح اندازہ لگانے کا اہل ہو۔ اسی ضمن میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب رضا مندی کو کسی معاہدے کی شرط قرار دیا جائے تو وہ کسی دباؤ، فریب اور غلطی کے بغیر بالکل آزادانہ ہو۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

ان اللہ تجاوز عن امتی الخطا و النسیان و ما استکرھوا علیه(۱)

میری امت کو اس ذمہ داری سے سبکدوش کر دیا گیا ہے جو کسی قسم کی غلطی، بھول اور دباؤ سے ظہور میں آتی ہے۔

اس اصول کی تہہ میں اصل منشا یہ ہے کہ معاہدے میں شریک ایک فریق کو بے جا نقصان سے بچایا جائے۔ منصفانہ اور مناسب لین دین کی صورت میں یہ بھی ضروری ہے کہ اگر کوئی فریق مال چھوڑ دینے سے کوئی نقصان اٹھا رہا ہو تو اس کے بدلے میں برابر قیمت کا فائدہ بھی ضروری پہنچنا چاہیے۔ ایک مشہور قانون دان اور فلسفی بینتھم

کے بیان کے بموجب ''نقصان سے جو تکلیف لاحق ہو اس کا مداوا بدلے میں حاصل ہونے والی راحت سے کیا جائے''۔

ایسے فریب اور دھوکے سے بچانے کے لیے جس سے ایک فریق کو نقصان پہنچتا ہو اور کسی قسم کا کوئی فائدہ نہ ہوتا ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم نافذ کیا کہ فروخت کی جانے والی چیز فروخت کے موقع پر موجود ہو اور معاملے کے لیے پیش کی جا سکے۔ اگر وہ بعد میں مہیا کی جانے والی ہو تو واضح طور پر اس خوبی اور مقدار کی تفصیل بیان کی جائے۔ اس ضمن میں آپ نے یہ فرمایا کہ بیچی جانے والی چیز فروخت کنندہ کے قبضے میں ہونی چاہیے (۲)۔ قبضہ دیئے جانے سے متعلق تنازعات کو ختم کرنے کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے۔ یہ یقین دلانے کے لیے کہ بیچی جانے والی چیز فروخت کنندہ کی ملکیت ہے اور کسی اور کا اس پر حق نہیں ہے، آپ نے فرمایا کہ منڈی میں ایک جگہ سے فروخت کرنے کے لیے خریدا جانے والا اناج لازمی طور منڈی میں دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے۔ اسے صاف طور پر اس ذریعہ سے الگ کر دینا چاہیے جس سے فروخت کنندہ نے اسے خریدا تھا (۳)۔

معاہدہ فروخت کو فسخ کرنے کے اختیار کے بارے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تک دونوں فریق لین دین کے مقام سے چلے نہ جائیں، انہیں فسخ کرنے کا اختیار حاصل ہے (۴)۔ لیکن اگر کسی اور صورت میں اس اختیار کو کام میں لانے سے متعلق کوئی شرط معاہدے میں درج ہے تو پھر وہ شرط ان کو پابند کیے رہے گی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات پر زور دیا کہ فروخت کی جانے والی شے میں کوئی نقص ہو تو اسے ظاہر کر دیا جائے (۵)۔ اگر نقص ظاہر نہ کیا جائے اور خریدنے والا بعد میں اس حقیقت کا پتہ لگائے تو اسے حق حاصل ہوگا کہ وہ اس نقص کے انکشاف پر معاہدہ منسوخ کر دے۔ آپ نے لین دین کے ان تمام معاملات کو غیر قانونی قرار دے کر ان کی

مذمت کی جن میں قیاس آرائی اور سٹہ بازی کا شائبہ پایا جاتا ہو۔ اس زمانے میں بعض لوگ اپنی دکانوں میں فروخت کے مال کو پھیلا دیا کرتے تھے اور خریدار ان چیزوں پر کنکریاں پھینکتا جن کو وہ خریدنا چاہتا تھا اور جس چیز پر کنکری لگ جاتی وہ فروخت شدہ سمجھی جاتی تھی (۶)۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریقہ کار کو ممنوع قرار دیا۔ چوں کہ اس میں قمار بازی کا عنصر پایا جاتا ہے، اسی سبب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان جانوروں کی فروخت کو ممنوع قرار دیا جو شکم مادر میں ہوں (۷)۔ ان پھلوں کی فروخت کو ممنوع قرار دیا جو غیر پختہ ہوں (۸) اور ان مچھلیوں کی فروخت کو بھی ممنوع قرار دیا جو پانی میں ہوں (۹)۔ پھلوں کی فروخت کرنے کی اجازت اسی صورت میں دی گئی جب وہ توڑے جانے کے لائق حد تک پختہ ہو گئے ہوں (۱۰)۔ آپ نے اناج کی ذخیرہ اندوزی اور کم یابی پیدا کرنے کی غرض سے اس کی فروخت کو روک رکھنے اور پھر زیادہ نرخ پر بیچنے کو ممنوع قرار دیا (۱۱)۔ آپ نے ایسے مادہ جانوروں کو فروخت کرنے کی اجازت نہیں دی جن کا دودھ دو یا تین دن تک نہ دوہا گیا ہو (۱۲) کیوں کہ اس میں فریب کا عنصر پایا جاتا ہے۔ تازہ کھجوروں کا خشک کھجوروں سے تبادلہ یا ان کھجوروں کا ڈھیر کی صورت میں پڑی ہوئی ان کھجوروں سے جو حقیقتاً جل چکی ہوں، تبادلہ کرنا ممنوع قرار دیا گیا (۱۳)، کیوں کہ اس قسم کے لین دین میں بھی قیاس آرائی کا عنصر پایا جاتا ہے۔

اہلِ مدینہ کا دستور تھا کہ وہ ان لوگوں سے ملنے کے لیے شہر کے باہر جاتے جو دوسرے مقامات سے فروخت کا مال لے کر آتے تھے۔ اہلِ مدینہ وہیں ٹھہر کر ان سے سودا کر لیتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رواج کو ممنوع قرار دیا اور فرمایا کہ باہر والوں کو اپنا مال منڈی میں لا کر اور وہاں پہنچ کر فروخت کرنے کا موقع دیا جائے۔ آپ نے فروخت کو فسخ کرنے کا حق صرف ان باہر والوں کو دیا جن کو منڈی میں پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ منڈی میں چیزوں کا نرخ اس شرح سے بڑھا ہوا ہے جو

ان کو وصول ہوئی تھی(۱۴)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی ایسی چیز پر بولی لگانے کی اجازت نہیں دی جس پر کسی دوسرے شخص سے بات چیت ہو رہی ہو(۱۵)۔ یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ بولی دینے والا صرف فروخت کنندہ کے مفاد کی خاطر قیمت بڑھانے کے لیے ایسا کر رہا ہو۔ اگر بیچنے والے کے ایماء پر کوئی چیز دو اشخاص کے ہاتھ فروخت کر دی گئی ہو تو پہلے خریدار کو اسے پا لینے کا حق حاصل ہوگا۔ اگر درخت پر لگے پھل فروخت کے دیئے جائیں اور پھر قدرتی آفات کے باعث تباہ ہو جائیں پیشتر اس کے کہ خریدار ان کو توڑ کر جمع کر سکے تو اسے رقم واپس لینے کا حق حاصل ہوگا جو اس نے قیمت کے طور پر ادا کی ہو(۱۶)۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے بموجب کسی ایسے کام کی اجرت طلب کرنا ناجائز ہے جو بجائے خود حرام ہے، مثلاً بت بنانا یا شراب کشید کرنا۔ کسی مورت، شراب یا کتے کی فروخت پر کسی قیمت کا مطالبہ نہیں ہوسکتا(۱۷)۔ اسی طرح سود کا مطالبہ بھی نہیں ہوسکتا۔ آپ نے اس قانونی اصول کو ایک قانونی جملہ میں بیان کیا ہے ''نفع ذمہ داری کے ساتھ ملتا ہے''(۱۸)۔ ایک شخص نے ایک غلام خریدا لیکن غلام کا نقص خریدار پر منکشف نہیں کیا گیا۔ نقص کا انکشاف ہونے پر خریدار نے وہ غلام فروخت کنندہ کو واپس کر دیا، اس درمیانی وقفے میں جو کام غلام نے انجام دیئے ان کی اجرت فروخت کنندہ نے طلب کی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما کر اس مطالبے کو رد کر دیا کہ ''نفع ذمہ داری کے ساتھ ملتا ہے''۔ خریدنے والا غلام کو کھانا کھلانے کا ذمہ دار تھا۔ اسے یہ اندیشہ لاحق تھا کہ اگر اس درمیانی وقفے میں وہ (بھوک سے) مر جاتا تو نقصان اٹھانا پڑتا۔ ان کے قاعدے کے مطابق فروخت کنندہ کو اپنی بیچی ہوئی چیز کی قیمت وصول کرنے کا حق ہے۔ اگر بیچنے والے اور فروخت کنندہ کے درمیان کسی چیز کی فروخت پر کوئی تنازعہ کھڑا ہو جائے اور وہ چیز اس وقت موجود ہو تو اس صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قاعدے کے

مطابق بیچنے والے کے بیان پر اعتماد کیا جائے گا۔ اس صورت میں خریدار کو یہ اختیار رہو گا کہ وہ اس بیان کو قبول کرے یا رد کر دے۔ اگر وہ قبول کرے تو جھگڑا ختم ہو جائے گا۔ اگر رد کر دے تو وہ چیز فروخت کنندہ کو واپس مل جائے گی۔ یہ ایک مشہور قانونی اصول کی عمدہ مثال ہے جس کے تحت دونوں فریق سابقہ حالت پر واپس چلے جاتے ہیں۔

عام قانون کا یہ ایک بنیادی اصول ہے کہ لین دین کے تمام معاملات میں نفع نقصان دونوں فریقوں کے لیے برابر ہونا چاہیے۔ اگر ایک شخص کو نفع ہو اور دوسرے کو کلیتاً نقصان تو اس اصول کے تحت لین دین کالعدم ہو جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جاری کردہ احکام میں یہ اصول قانونی جھلک دکھاتا ہے۔

دیوالیہ ہونے کا قانون

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قانون کے اس پہلو کو بھی نظرانداز نہیں کیا۔ انہوں نے اپنے ایک صحابی حضرت معاذؓ کی جائیداد اپنے قبضے میں کر لی جو دیوالیہ ہو گئے تھے۔ اسے فروخت کر دیا اور فروخت کی رقم کو قرض خواہوں میں تقسیم کر دیا(۱۹)۔ آپ نے یہ حکم بھی دیا کہ اگر کوئی قرض خواہ اپنا مال کسی دیوالیہ مقروض کے قبضے میں پائے تو اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس سے واپس لے لے۔ یہ اصول، دیوالیہ ہونے کے اس اصولِ قانون کی بہ نسبت زیادہ قرین انصاف ہے جو اس وقت رائج ہے اور جس کے تحت ایسی چیز کی قیمت دوسرے قرض خواہوں میں بھی تقسیم ہو جاتی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے بموجب کنویں کا پانی، خودرو گھاس اور آگ مشترک املاک ہیں (۲۰)۔ ایک دیا سلائی کسی دوسرے شخص کی آگ سے روشن کی جا سکتی ہے لیکن اس طرح نہیں کہ وہ آگ بجھ جائے۔ نہر کے بہتے ہوئے پانی کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ وہ ساحلی کھیتوں کے سب مالکوں کی ملکیت ہے (۲۱)۔ البتہ ایک شخص اپنے کھیت میں آبپاشی کے لیے نہر کا پانی اس وقت تک روک سکتا ہے جب تک کہ کھیت میں

وہ پانی ٹخنوں تک نہ آجائے (۲۲)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے لوگوں کی زمین پر مداخلت بے جا کو ممنوع قرار دیا۔ البتہ آپ نے فرمایا کہ اگر کوئی ایسا قطعہ زمین ہو جو کبھی کسی کے قبضے میں نہ رہا ہو یا زیر کاشت نہ آیا ہو تو کوئی بھی مسلمان اس پر کاشت کر سکتا ہے، اس کے گرد باڑ لگا سکتا ہے یا دیوار چنوا سکتا ہے (۲۳)۔ یہ بات عام قانون کے اس مشہور اصول کے مطابق ہے جس کے تحت زمین پر ''پہلے قابض'' کی ملکیت کو تسلیم کیا جاتا ہے۔

حق شفعہ کا قانون

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم قانون کی اس شق کے شارع ہیں کیوں کہ ان سے قبل وہ کہیں بھی رائج نہیں تھی۔ آپ کے وضع کردہ اس قانون کے تحت کسی جائیداد، غیر منقولہ زمین یا مکان کے ایک حصے دار کو یہ ترجیحی حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے ساجھی کا حصہ خرید لے۔ اجنبی لوگ صرف دوسرے حصہ داروں کی رضامندی پر یا خریداری سے ان کے انکار پر خرید سکتے ہیں۔ اسی اصول پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خریداری کا ترجیحی حق ان لوگوں کو دیا جنہیں بیچنے والے کے ساتھ ساتھ فروخت ہونے والی جائیداد پر سے ہو کر گزرنے کا حق حاصل ہو (۲۴)۔ یہ قاعدے اس لیے وضع کیے گئے تا کہ اجنبی لوگوں کو حصہ داری سے الگ رکھا جائے کیوں کہ ناپسندیدہ لوگوں کے داخلے سے عام طور پر جھگڑے ہوتے ہیں۔ اس قاعدے پر عمل کرنے سے تنازعات کے تمام راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔

پٹے پر اراضی

دنیائے عرب کے ایک عام رواج کے مطابق جب کوئی اراضی کاشت کے لیے کسی کرائے دار کو پٹے پر دی جاتی تو پیداوار میں سے اس کرایہ دار کا حصہ اس طرح متعین کیا جاتا کہ کھیت کا ایک حصہ اس کے لیے مخصوص ہو جاتا اور وہ اس مخصوص قطعہ زمین کی

پیداوار سے اپنا حصہ حاصل کر لیتا۔ لیکن اتفاق کی بات ہے کہ کبھی کرایہ دار کے حصہ اراضی پر اور کبھی مالک کے حصہ اراضی پر کوئی فصل بالکل تیار نہیں ہوئی یا اس کی مقدار اتنی نہ ہوئی کہ اس حصہ دار کا معاوضہ کافی ہو جاتا جس کے لیے وہ مخصوص کی گئی ہے۔ یہ بھی ایک قسم کی قمار بازی تھی۔ لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رواج کو ممنوع قرار دیا اور حکم دیا کہ سارے کھیت کی پیداوار ایک جگہ جمع کی جائے اور پھر مالک و کرایہ دار کے مابین ان کے متفقہ حصص کے مطابق تقسیم کر دی جائے (۲۵)۔ آپ نے اس بات پر اصرار کیا کہ حصص کا تعین پہلے ہی سے کر لیا جائے۔ آپ نے ایک سال سے زیادہ مدت کے لیے بھی پٹے کی اجازت نہیں دی۔ اگر کسی درخت کے پھل پٹے پر دیئے جائیں اور وہ پھل آفاتِ قدرتی سے ضائع ہو جائیں تو مالک کو لازم ہوگا کہ وہ پٹے کی رقم پٹہ لینے والے کو واپس کر دے (۲۶)۔

مالک اور ملازم

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اجرت کی ادائیگی پر خدمت لینے کی اجازت دی ہے (۲۷)۔ چنانچہ وہ خود بھی بعثت سے پہلے اجرت لے کر اہلِ مکہ کی بکریاں چرایا کرتے تھے (۲۸) اور آپ نے ان لوگوں کو بھی اجرت ادا کی جو زمانہ بنوت میں آپ کے لیے خدمات انجام دیتے تھے۔ آپ کا اصرار تھا کہ مزدور کی اجرت ادا کر دو، اس سے پہلے کہ اس کی پیشانی کا پسینہ خشک ہو (۲۹)۔

ہبہ

احادیث نبوی کے مطابق ہبہ کرنے کی اجازت ہے (۳۰)۔ سوائے اس کے کہ ایک باپ اس ہبہ نامے کی تنسیخ کر سکتا ہے جو اس نے اپنے بیٹے کے نام کیا ہے، تمام ہبہ نامے ناقابلِ تنسیخ ہیں (۳۱)۔ باپ کی طرف سے بیٹے کے نام ہبہ نامہ صرف اس وقت منسوخ ہو سکتا ہے کہ جب ہبہ کی ہوئی جائیداد بالکل اسی صورت میں موجود ہو جو ہبہ کرنے

کے وقت تھی (۳۲)۔ لیکن اگر اسے کسی صورت میں بدل دیا گیا ہے، مثال کے طور پر ہبہ کی ہوئی اراضی پر عمارت تعمیر کر لی گئی ہے تو وہ ناقابلِ تنسیخ ہے، خواہ وہ باپ ہی نے بیٹے کو دی ہو۔ اس امتیازی صورت سے ظاہر ہوتا ہے کہ قانون وضع کرنے والے کی دماغی صلاحیت کس درجہ منصفانہ تھی۔

وقف

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے بموجب عمر بھر کے لیے وقف کرنے کی اجازت ہے۔ آپ نے ایسے وقف کی مذمت کی ہے جب ایک وارث کو دوسرے وارثوں کے مقابلے میں ترجیح دی جائے۔ یہ فیصلہ اس لیے کیا گیا کہ اس طرح اس وارث کے خلاف دوسرے وارثوں کے دلوں میں نفرت اور عداوت کے جذبات نشو ونما پاتے ہیں اور جس وارث کو ترجیح دی گئی ہے وہ حسد کا شکار ہو جاتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے نام پر اراضی وقف کرنے اور مذہبی مقاصد کے لیے اسے بطور عطیہ دے دینے کی اجازت دی ہے۔ آپ نے ایک مخصوص قسم کے مشروط عطیے کو بھی تسلیم کیا ہے جو شرع میں ''رقبیٰ'' کہلاتا ہے (۳۳)۔ وہ ایک ایسا عطیہ ہوتا ہے جس کے ساتھ اس قسم کی شرط لگائی جاتی ہے کہ اگر عطیہ پانے والا عطیہ دینے والے سے پہلے مر جائے تو عطا کی ہوئی جائیداد عطیہ دینے والے کو واپس مل جاتی ہے۔ لیکن اگر عطیہ دینے والا پہلے مر جائے تو جائیداد عطیہ پانے والے کی قطعاً ملکیت ہو جاتی ہے۔ اس فائدے کی خوبی بالکل واضح ہے۔

گرا پڑا سامان

اگر کسی شخص کو ایسا کوئی سامان ملے جس کا کوئی دعویدار نہ ہو تو وہ اس پر قابض ہو سکتا ہے (۳۴)، لیکن ایک حدیث کے مطابق اس کا فرض ہو گا کہ وہ چالیس دن تک اس کا اعلان کرتا رہے اور ایک دوسری حدیث کے مطابق ایک سال تک اعلان کرتا رہے۔ اگر

اصل مالک حاضر ہونے سے قاصر رہے اور سامان کا کوئی دعویدار نہ ہو تو پھر وہ سامان اس شخص کا ہو جائے گا (۳۵)۔ اگر اصل مالک آ جائے اور سامان کا مطالبہ اس وقت کرے جب وہ استعمال میں آ گیا ہو تو استعمال کرنے والے کو چاہیے کہ وہ اصل مالک کو اس کی قیمت ادا کرے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ضروری اعلان اور تشہیر کے بغیر سامان کے تصرف کی مذمت کی ہے (۳۶) کیوں کہ ایسا فعل امانت میں خیانت کے مترادف ہے۔

آپ نے اس سلسلے میں یہ بھی فرمایا کہ اس اعلان پر دو گواہوں کی تصدیق ہونی چاہیے تاکہ بے دعویٰ جائیداد دبانے والے کو کہیں اس کے ناجائز تصرف کی ترغیب نہ ہو جائے اور اگر مدعی سامان پانے والے کی وفات کے بعد اپنا دعویٰ کرے تو مرنے والے کے ورثاء اسے اپنے باپ کی املاک سمجھ کر اس پر قابض نہ رہیں۔

وصیت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے وارثوں کے حق میں وصیت کرنے سے منع فرمایا ہے جو فرمانِ الٰہی کے بموجب پہلے سے وارث ہوں (۳۷) کیوں کہ اس طرح دوسرے وارثوں کے حصص میں کتر بیونت ہو سکتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وصیّت کے ذریعے جائز وارثوں کو نقصان پہنچانے کے خلاف تھے اور آپ کے نزدیک ایسا فعل احکامِ الٰہی میں مداخلت کے مترادف ہے۔ آپ کا منشا یہی تھا کہ ترجیحی حیثیت پانے والے کسی طرح رشک و حسد کا نشانہ نہ بنیں۔

وراثت

ایک حدیث نبوی کے مطابق کوئی مشرک وارث کسی مسلمان کے مال و متاع کا وارث نہیں بن سکتا (۳۸) اور اسی طرح مسلمان وارث کسی مشرک رشتے دار کی جائیداد کا وارث قرار نہیں پا سکتا۔ کوئی مسلمان کسی ایسے شخص کے مال و متاع کا وارث نہیں بن سکتا

جسے اس نے مار ڈالا ہو(۳۹)۔ ایسی ممانعت کے بغیر یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ وارث، جلد حقِ وراثت حاصل کرنے کے لیے کہیں اپنے اسلاف کو ہلاک نہ کردیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وضع کردہ ایک اور قاعدے کے مطابق اگر کوئی وارثِ جائیداد شکم مادر میں ہے تو اس کی پیدائش کے وقت تک متوفی کی جائیداد پر حقِ وراثت کا فیصلہ ملتوی رکھا جائے۔ اگر وہ زندہ پیدا ہو تو جائیداد پر اس کا حق ہوگا اور اگر وہ مردہ پیدا ہوا تو اس کا کوئی حق نہ ہوگا(۴۰)۔ آپ کے قاعدے کے مطابق وہ بچہ مردہ تصور ہوگا جو شکم مادر سے باہر آنے کے بعد چیخ کر رونے سے پہلے مرجائے۔ اس موقع پر چیخ کا سنائی دینا زندگی کی علامت ہے۔ اگر وہ چیخ سنانے کے بعد مرجائے تو اس زندہ پیدا ہونے والوں میں شمار کیا جائے گا(۴۱)۔ ایک ناجائز طور پر پیدا ہونے والا لڑکا وارث نہیں ہوتا (۴۲)۔ اسی طرح وہ بچہ جو ایسے تعلقات کے بعد پیدا ہو جن کے بارے میں جماع کا فعل موضوع بحث ہو یعنی عورت اور مرد بدکاری کا ارتکاب کریں اور اس بدکاری کے نتیجے میں پیدا ہو تو وہ وارث نہیں ہوگا۔

شادی یا نکاح

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات پر زور دیا کہ ہر وہ شخص جو مہر ادا کرنے کی استطاعت رکھتا ہو اور بیوی کا خرچ برداشت کرسکتا ہو، ضرور رشتہ ازدواج میں منسلک ہو (۴۳)۔ مہر کی رقم نقد یا سامان کی صورت میں ہوسکتی ہے۔ لیکن آپ نے تبادلہ (وٹہ سٹہ) کی شادیوں کو ممنوع قرار دیا جن میں مہر کی کوئی رقم نقد یا سامان کی صورت میں نہیں دی جاتی بلکہ ایک شخص اپنی بہن دوسرے شخص کے نکاح میں دیتا اور اس کے عوض اس کی بہن کو اپنی بیوی بنالیتا ہے(۴۴)۔

فرمانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق مہر ایک قرضہ ہے اور اسے تمام قرضوں پر ترجیحی حیثیت حاصل ہے اور وہ نکاح کے ضمن میں ایک لازمی شرط ہے۔

فریقین کی مرضی کے بغیر کوئی نکاح باضابطہ نہیں ہوتا۔ شادی کی تجویز پیش ہونے پر کسی فریق کا خاموش رہنا رضامندی کے مترادف سمجھا جائے گا۔ لیکن اگر لڑکی کمسن ہو تو باپ کی رضامندی ضروری ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح سے پہلے لڑکی کو دیکھنے کی اجازت دی ہے۔ نکاح کے لیے دو گواہ ضروری ہیں۔

قرآن پاک میں مذکورہ جن رشتہ داروں کے مابین شادیوں کو ممنوع قرار دیا گیا ہے ان کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ امتناعی حکم دودھ شریک رشتہ داروں پر بھی عائد ہوتا ہے۔ گویا رضاعی رشتہ دار حقیقی رشتہ داروں کے برابر حیثیت رکھتے ہیں (۴۵)۔ آپ نے ایک ایسی عورت کے ساتھ نکاحِ ثانی کو بھی ممنوع قرار دیا جو موجودہ بیوی کی خالہ، پھوپھی بھانجی یا بھتیجی ہو (۴۶)۔ آپ نے رشک وحسد سے بچانے کی خاطر لوگوں کو منع فرمایا کہ کسی ایسی لڑکی کے لیے شادی کا پیغام نہ بھیجیں جس سے کسی اور شخص کی شادی کی بات چیت چل رہی ہو (۴۷)۔ آپ نے شادی کی تشہیر کے لیے تاکید کی تاکہ جس قدر زیادہ وسیع پیمانہ پر ممکن ہو لوگوں کو اصل حقیقت کا پتہ لگ جائے (۴۸)۔

طلاق

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طلاق کی مذمت کرتے ہوئے اللہ کے نزدیک اسے سب سے زیادہ قابلِ نفرت فعل قرار دیا۔ اس کی اجازت صرف اس صورت میں دی گئی جب ایسا نہ ہونے کی صورت میں ازدواجی زندگی ناقابلِ برداشت ہو۔ دورانِ حمل میں کسی عورت کو طلاق نہیں دی جا سکتی یعنی جب تک بچہ رحم سے باہر نہ آ جائے ایسا نہیں ہو سکتا۔ مطلقہ کے لیے ضروری ہے کہ نکاحِ ثانی سے احتراز کرے، جب تک کہ عدّت کا زمانہ ختم نہ ہو جائے (۴۹) اور اس دوران خاوند کو اس کی کفالت کرنی ہو گی (۵۰)۔ وہ شوہر جس نے کسی عورت کو طلاق (مغلظ) دے دی ہو اسی عورت سے دوبارہ شادی نہیں کر سکتا تاوقتیکہ وہ عورت کسی اور شخص سے شادی نہ کر لے اور اس سے

طلاق لے کر زمانہ عدّت ختم نہ کرے(۵۱)۔ یہ تاکید اس لیے کی گئی ہے تاکہ لوگ تمام پہلوؤں پر غور کیے بغیر طلاق دینے میں جلد بازی سے اجتناب کریں۔

ہرجانہ

اگر کسی شارع عام پر کوئی جانور کسی شخص کو زخمی کر دے تو جانور کا مالک زخمی ہونے والے کو تاوان ادا کرنے کا ذمہ دار ہوگا(۵۲)۔ یہ ہرجانے کے مروّجہ قانون کے اصول کے عین مطابق ہے جس کے بموجب جانوروں کے مالکان پر یہ ذمہ داری ڈالی جاتی ہے کہ وہ اپنے جانور کے طرزِ عمل کا خیال رکھیں۔

فوجداری قانون

اگرچہ قرآن پاک میں تمام جرائم گنوائے گئے ہیں اور ہر جرم کی سزا متعین کی گئی ہے تاہم رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فوج داری قانون کے چند اصول بیان کیے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے شخص کے لیے جس کی بیوی موجود ہو اور وہ کسی دوسری عورت کے ساتھ بدکاری کرے، موت کی سخت سزا مقرر کی (۵۳)۔ قرآن میں بدکاری کی یہ سزا مقرر کی گئی ہے کہ صرف ایک سو کوڑے مارے جائیں (۵۴) لیکن رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے بدکاری کی دو قسموں کے درمیان واضح امتیاز قائم کیا ہے(۵۵)۔ ایک وہ بدکاری جو کنوارا شخص کرے اور ایک وہ بدکاری جو شادی شدہ شخص کرے۔ مؤخرالذکر کی چونکہ ایک بیوی موجود ہوتی ہے، اس لیے اس فعل مذموم کے ارتکاب کا کوئی جواز اس کے لیے نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے مسلمان کے لیے بھی سزائے موت مقرر کی ہے جو مشرک ہو جائے (۵۶)۔ آپ نے ہر شخص کو اپنی مدافعت کا حق دیا اور اس پر عمل کرتے ہوئے اختیار دیا کہ وہ حملہ آور کو زخمی کر سکتا ہے اور اس کے عوض کسی تاوان کا مطالبہ اس سے نہیں ہو سکتا (۵۷)۔ آپ ایک عطائی

کو اس شخص کی موت کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں جو اس کے غلط علاج کے باعث فوت ہو گیا۔ ایسی صورت میں اس پر صرف تاوان ڈالا جا سکتا ہے (۵۸)۔

اگر کسی حاملہ عورت کے خلاف جس کے رحم میں بچہ ہو، سزائے موت صادر ہو تو سزا کی تعمیل میں اس وقت تک تاخیر کی جائے جب تک وہ بچہ جنم دے کر فارغ نہ ہو جائے (۵۹)۔ تمام مہذب ملکوں میں یہ قانون آج بھی رائج ہے۔ آپ نے بدکاری کا ارتکاب ہونے پر ایک عورت کو سنگسار کرنے سے بھی منع کیا جب کہ وہ اپنی چھاتی سے ایک بچے کو دودھ پلا رہی ہو (۶۰)۔ اس بات کی اجازت دی کہ بچہ کی شکم سیری کا مناسب انتظام کر دینے کے بعد اسے سنگسار کیا جائے۔ اگر کسی حاملہ عورت کو مار ڈالا جائے تو رحم مادر میں مرنے والے بچے کا قصاص بھی قابل ادائیگی ہو گا (۶۱)۔ یہ اس رائج الوقت قانون سے بہتر ہے جس کے بموجب رحم کے اندر مرنے والے بچے کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی۔ مجھے کسی ایسے نظامِ قانون کا علم نہیں ہے جس کے تحت اس طور سے رحم کے اندر پرورش پانے والے بچے کے قاتل پر تاوان ڈالا گیا ہو۔ دنیا میں بہت کم ایسے آئین ساز ہوں گے جو اس قدر جزئیات پر نظر رکھتے ہوئے انصاف چاہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے مقدموں میں باہمی سمجھوتے کی اجازت نہیں دی جن کے بارے میں جرم کی سزا اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کی گئی ہو۔ ایک مرد نے ایک عورت کے ساتھ بدکاری کی اور اسے تاوان ادا کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تاوان واپس کرنے کے لیے عورت کو حکم دیا اور مرد کو مقررہ سزا دی۔ آپ نے بیوی کو اجازت دی کہ وہ اپنے خاوند کی جیب سے اس کی اجازت کے بغیر اتنی رقم نکال لے جو گھر کے اخراجات کے لیے ضروری ہو، اسے چوری تصور نہیں کیا گیا (۶۲)۔ آپ نے فوجداری مقدمات میں پیش ہونے والی سفارشات کی مذمت کی اور فرمایا کہ جو بھی شخص اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقررہ سزاؤں میں نرمی برتنے کی سفارش کرتا ہے وہ گویا اللہ

کی مخالفت کرتا ہے(۶۳)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ ایک منصف کے لیے یہ بہتر ہے کہ وہ غلطی سے مجرم کو بری کر دے بہ نسبت اس کے کہ وہ غلطی سے کسی کو سزا دے (۶۴)۔ یہ فرمان قانون سازی کے جدید اصول کے عین مطابق ہے جس میں بیان کیا گیا ہے ''ایک بے قصور کو سزا دینے کی بہ نسبت سو مجرم اشخاص کو بری کر دینا بہتر ہے''۔ آپ نے ایک نہایت عمدہ قانونی جملے کے حسبِ ذیل الفاظ میں ذمہ داری کے اصول کا خلاصہ پیش کیا ہے: ''جب غلطی، بھول چوک اور جبر واکراہ سے کام لیا جائے تو ذمہ داری کا سوال پیدا نہیں ہوتا'' (۶۵)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حاکم یمن کے نام ایک مراسلہ میں تاوان کا پیمانہ مقرر کیا ہے جو فوج داری مقدمات میں سزا دیتے وقت ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ کسی کو قتل کر دینے کی صورت میں قصاص کے طور پر حسبِ ذیل عمر کے سو جانور مقرر کیے(۶۶): ایک سال کی عمر کی بیس اونٹنیاں، دو سال کی عمر کی بیس اونٹنیاں، تین سال کی عمر کی بیس اونٹنیاں، چار سال کی عمر کی بیس اونٹنیاں اور پانچ سال کی عمر کے بیس اونٹ۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ہر معاملے میں کس درجہ محتاط تھے۔ یہ پیمانہ مرتب کرنے کے شاید دو سبب تھے: اوّل یہ کہ اگر ایک ہی عمر کے اونٹ مقرر کر دیئے جاتے تو ایسے ایک سو اونٹ تلاش کرنا دشوار ہو جاتا اور (دوم یہ کہ) اگر کوئی عمر مقرر نہ کی جاتی تب بھی جھگڑا رہتا۔ اس صورت میں ایک شخص سب کے سب جوان یا سب بوڑھے اونٹ پیش کرتا۔ اس پیمانے کے مطابق تمام ایک ہی وقت میں نہ مرتے۔ اس طرح مالک کی تحویل میں چند اونٹ ہمیشہ موجود رہتے۔ دانت توڑنے یا زبان کاٹنے کا تاوان پانچ اونٹ مقرر ہے(۶۷)۔ عورت کو قتل کرنے کی صورت میں قصاص اتنا ہی ہے جتنا ایک مرد کو قتل کرنے پر مقرر کیا گیا ہے(۶۸)۔ انگلی کاٹ دینے کا تاوان دس اونٹ

مقرر کیا ہے(۶۹)۔ چوٹ لگنے کی صورت میں جب کہ زخم اتنا گہرا ہو کہ ہڈی دکھائی دینے لگے، تاوان پانچ اونٹ رکھا گیا ہے(۷۰)۔

جنگ کے قوانین

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فوج کے سپہ سالاروں کو تاکید کی تھی کہ کسی بھی ملک کو فتح کر لینے کے بعد ان کے فرائض یہ ہوں گے:

الف: لوگوں کے ساتھ نرمی برتیں اور انہیں خوش خبری سناتے رہیں

ب: ان کی آسائشوں کا خیال رکھیں اور ان پر کوئی سختی نہ ہونے دیں اور

ج: ایک دوسرے کی فرماں برداری کریں اور نافرمانی سے اجتناب کریں(۷۱)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بین الاقوامی معاہدوں سے انحراف کی مذمت کی(۷۲)۔ آپ نے دورانِ جنگ میں عورتوں، بچوں، ضعیفوں اور مذہبی رہنماؤں کو قتل کرنے سے منع کیا(۷۳)۔ آپ نے پھل والے سایہ دار درختوں کو کاٹنے اور عبادتِ الٰہی کے لیے مخصوص مقامات کو منہدم کرنے کی ممانعت کی۔ مالِ غنیمت سے پیدل فوج کے سپاہیوں کا حصہ گھوڑ سوار افواج کے افراد کے مقابلے میں نصف مقرر کیا(۷۴)۔

حکومت اور عدلیہ سے متعلق قوانین

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر اس شخص کو جو سرکاری عہدے پر تقرری کے لیے کوشاں ہو، اس کے لیے نااہل قرار دیا(۷۵)۔ پسند کا فیصلہ اس امیر کو تفویض کیا جسے عوام کا نمائندہ ہونا ہے۔ اس منصف کو جو جان بوجھ کر غلط اور غیر منصفانہ فیصلے کرے ''شیطان کا چیلہ'' کہا گیا۔ دیانت دار منصفوں کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ قیامت کے دن وہ خدائے تعالیٰ کے دائیں جانب مقام حاصل کریں گے(۷۶)۔

رشوت سے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رشوت دینے والا اور رشوت لینے والا دونوں جہنم میں جائیں گے(۷۷)۔ آپ نے منصفوں کو تاکید کی کہ ایک مقدمہ

میں پیروی کرنے والے فریقین کے ساتھ عدالت میں یکساں برتاؤ کیا جائے (۷۸)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ بھی ہدایت کی کہ ان میں سے ہر ایک کا بیان سنے بغیر فیصلہ نہ دیا جائے (۷۹)۔ اسی قاعدہ کے مطابق ایک منصف کو مقدمے کا فیصلہ دینے سے روکا گیا ہے کہ جب وہ غصے کی حالت میں ہو (۸۰)۔ شراب کی قیمت، جوئے کے قرضے، کتے کی قیمت اور ایسی ہی کسی چیز کی وصولی کے لیے جسے حرام قرار دیا گیا ہے، مسلمانوں میں کسی عدالت میں کوئی مقدمہ دائر نہیں کیا جا سکتا (۸۱)۔ ایک جانور جو قرضے کی رقم کے عوض کسی کے پاس رکھا گیا ہو، سواری کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ اس کی کفالت قرض دینے والے کے ذمہ ہو (۸۲)، بصورت دیگر اسے استعمال میں نہیں لایا جا سکتا۔ آپ نے جھوٹی شہادت سے منع فرمایا ہے (۸۳)۔ قانونِ شہادت میں یہ شرط بھی لگائی گئی ہے کہ کسی بدنام شخص کی گواہی نہ لی جائے (۸۴)۔ نیز ان لوگوں کی گواہی نہ لی جائے جو اس فریق سے عداوت رکھتے ہوں جس کے خلاف وہ پیروی کر رہے ہیں (۸۵)۔ کسی مالک کے حق میں اس کے ملازم کی گواہی قابل قبول نہیں ہے (۸۶)۔

زکوٰۃ وصول کرنے والے کو تحائف قبول کرنے سے منع کیا گیا ہے، البتہ وہ صرف ان لوگوں (دوستوں اور رشتہ داروں) سے تحائف قبول کر سکتا ہے جو اس صورت میں بھی جب کہ وہ اس عہدے پر فائز نہ ہوتا، تحفے پیش کرتے (۸۷)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صاحب اختیار لوگوں کی تابع داری کرنے کی تاکید فرمائی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اس تابع داری سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر اثر نہ پڑے: لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق (۸۸)۔ آپ نے فرمایا کہ ہم میں سے تقریباً ہر شخص کو اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ حساب دینا ہوگا کہ اس نے یہ ذمہ داری کس طور سے پوری کی تھی۔

تمام مقننین کے نزدیک اس قانون کا مقصد یہ ہے کہ معاشرے میں امن و عافیت اور نظم ونسق کی فضا طاری رہے۔ ہر شخص کو اس امر کی ضمانت دی جا سکے کہ وہ اپنے

حق کے مطابق لطف اندوز ہوسکتا ہے اور دوسرے لوگوں کے حقوق ومراعات سے متعلق خلاف ورزیوں کو روکا جا سکے۔ انہی مقاصد کی تحصیل کی خاطر رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم تمام عمر کوشاں رہے اور آپ نے ضابطہ قانون کے بنیادی اصول مرتب کر دیئے۔ اپنے ان احکام کی روشنی میں اصولوں کی مطابقت میں آئین تیار کرنے کا کام بعد میں آنے والے مسلمانوں کی لیے اٹھا رکھا تا کہ وہ ان کے زمانہ، حالات اور ان کی احتیاج پوری کرنے کے لائق ہو۔ بعد کے زمانوں میں مسلمان مقننین نے اپنے وقت کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے قوانین بنائے اور اس مقصد کے لیے اجماع، قیاس اور اجتہاد کا لحاظ رکھا۔ لیکن ہر حال میں انہوں نے قرآن اور سنّت کے احکام کو مشعلِ راہ بنایا اور قانون بنانے کے لیے راستے مقررہ حدود میں رہتے ہوئے آج بھی ہمارے سامنے کھلے ہیں۔

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سرزمین عرب کے شہر مکہ معظّمہ میں ہوئی جہاں انہیں کسی مکتب یا مدرسے میں داخل ہونے کا موقع نہ مل سکا۔ وہ پڑھنا لکھنا بالکل نہیں جانتے تھے۔ لیکن ایسی کوئی تعلیم نہ ہونے کے باوجود آپ نے وہ قانونی اصول ہم کو عطا کیے جو کئی لحاظ سے دنیا بھر کے دوسرے ممتاز مقننین کے اصولوں سے سبقت لے گئے۔ جسٹینین، آگسٹن اور منو اگر بعد میں پیدا ہوتے، ایک لمحے کے لیے تذبذب کیے بغیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کا لوہا مان لیتے۔ وہ ان کو ایک ممتاز قانون ساز اور معلمِ قانون تسلیم کرتے بشرطیکہ آنحضرت کے اقوال زریں ان تک پہنچ جاتے۔ یہ حقیقت کہ ایک انسان جو کرۂ ارض پر کسی استاد کا شاگرد نہ رہا ہو، ایک ممتاز معلّمِ قانون بن جائے جو یقیناً علم کی ایک دشوار منزل ہے تو یہ اس کی معجزہ نمائی کا بیّن ثبوت ہے۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبری کے دعویٰ کو صحیح ثابت کرنے کے لیے ایک مضبوط دلیل بھی ہے۔

نگار من کہ بہ مکتب نہ رفت وخط نہ نوشت
بہ یک نگہ سبق آموز صد مدرس شد

حوالہ جات

۱۔ سنن ابن ماجه، کتاب الطلاق، باب طلاق المکره و الناسی

۲۔ جامع الترمذی، کتاب البیوع، باب ماجاء فی کراهیة بیع مالیس عندکم

۳۔ صحیح مسلم، کتاب البیوع، باب بطلان بیع المبیع قبل القبض

۴۔ ایضاً،باب ثبوت خیار المجلس للمتبایعین

۵۔ جامع الترمذی، کتاب البیوع،باب ما جاء فی کراهیة الغش فی البیوع

۶۔ جامع الترمذی، کتاب البیوع، باب ماجاء فی کراهیة بیع الغرر

۷۔ صحیح مسلم، کتاب البیوع،باب تحریم بیع حبل الحبلة

۸۔ جامع الترمذی، کتاب البیوع،باب ما جاء فی کراهیة بیع الثمرة حتی یبدو صلاحها

۹۔ ایضاً، باب ماجاء فی کراهیة بیع الغرر

۱۰۔ ایضاً،باب ماجاء فی کراهیةبیع الثمرة حتی یبدو صلاحها

۱۱۔ ایضاً،باب ماجاء فی الاحتکار

۱۲۔ صحیح مسلم، کتاب البیوع ، باب حکم بیع المصراة

۱۳۔ سنن ابی داؤد، کتاب البیوع، نیزسنن النسائی ، باب اشتراء التمربالرطب

۱۴۔ جامع الترمذی، کتاب البیوع، باب ماجاء فی کراهیة تلقی البیوع

۱۵۔ صحیح مسلم ،کتاب البیوع، باب تحریم بیع الرجل علی بیع اخیه المسلم

۱۶۔ سنن ابی داؤد، کتاب البیوع، باب فی وضع الحاجة

۱۷۔ ملاحظہ ہوان اشیاء کی خرید وفروخت اور قیمت کی ممانعت:صحیح مسلم، کتاب المساقاة و المزارعة

۱۸۔ باب تحریم الخمرو المیتة والخنزیر والاصنام ، نیزصحیح البخاری کتاب البیوع ، باب ثمن الکلب

۱۹۔ دیوالیہ ہونے کی صورت میں جائیداد کی فروخت اور قرض خواہوں کوادائیگی کے حکم کے لیے ملاحظہ ہو:صحیح البخاری، کتاب الاستقراض واداء الدیون، باب من باع مال المفلس

۲۰۔ حدیث میں ہے: المسلمون شرکاء فی ثلث فی الماء و الکلاء والنار، سنن ابی داؤد، کتاب البیوع ،باب فی منع الماء

۲۱۔ صحیح البخاری، کتاب المساقاۃ، باب سکر الانہار

۲۲۔ ایضاً، باب شرب الاعلی الی الکعبین

۲۳۔ جامع الترمذی، کتاب الاحکام، باب ماذکر فی احیاء ارض الموات

۲۴۔ جامع الترمذی، کتاب الشفعۃ، باب ماجاء فی الشفعۃ

۲۵۔ صحیح البخاری، کتاب المزارعۃ، باب المزارعۃ بالشطر

۲۶۔ سنن ابی داؤد ،کتاب البیوع، باب فی وضع الحاجۃ

۲۷۔ صحیح البخاری ، کتاب الاجارۃ، باب فی الاجارۃ

۲۸۔ ایضاً، باب رعی الغنم علی قراریط

۲۹۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الرھون، باب اجر الاجراء

۳۰۔ صحیح البخاری، کتاب الھبۃ وفضلھا والتحریض علیھا

۳۱۔ ایضاً، باب لایحل لاحد ان یرجع فی ھبتہ وصدقتہ

۳۲۔ ایضاً، کتاب الھبۃ للولدوھل للوالد ان یرجع فی عطیتہ

۳۳۔ جامع الترمذی، کتاب الاحکام، باب ماجاء فی الرقبی۔ نیز ملاحظہ ہو: صحیح البخاری، کتاب الھبۃ ،باب ماقیل فی العمری والرقبیٰ

۳۴۔ صحیح البخاری، کتاب ،نیز باب اذالم یوجد صاحب اللقطۃ بعد سنۃ فھی لمن وجدھا

۳۵۔ ایضاً، باب اذا جاء صاحب اللقطۃ بعد سنۃ ردھا الیہ

۳۶۔ حدیث میں ہے:من اوی ضالۃ فھو ضال مالم یعرفھا۔صحیح مسلم ،کتاب اللقطۃ

۳۷۔ جامع الترمذی، کتاب الوصایا ،باب ماجاء لاوصیۃ لوارث

۳۸۔ جامع الترمذی، کتاب الفرائض ، باب ماجاء فی ابطال المیراث بین المسلم والکافر، نیز باب لایتوارث اھل الملتین

۳۹۔ ایضاً، باب ماجاء فی ابطال میراث القاتل

۴۰۔ سنن ابی داؤد ،کتاب الفرائض ، باب ماجاء فی ابطال میراث ولد الزنا

۵۰۔ ایضاً

۴۲۔ جامع الترمذی، کتاب الفرائض ،باب ماجاء فی ابطال میراث ولدالزنا

۴۳۔ صحیح البخاری،کتاب النکاح،باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم من استطاع منکم الباء ۃ فلیتزوج

۴۴۔ ایضاً،باب الشغار

۴۵۔ صحیح البخاری،کتاب النکاح ،باب وامھا تکم الا تی ارضعنکم، ویحرم من الرضاعة مایحرم من النسب.

۴۶۔ ایضاً، باب لاتنکح المراۃ علی عمتھا

۴۷۔ ایضاً،باب لایخطب علی اخیہ حتی ینکح او یدع

۴۸۔ مثلاً شادی کے لیے دف وغیرہ کی اجازت کے لیے ملاحظہ ہو:صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب فی ضرب الدف

۴۹۔ صحیح البخاری،کتاب الطلاق باب قول اللہ تعالیٰ یاایھاالنبی اذا طلقتم النساء فطلقوھن لعدتھن واحصوا العدۃ

۵۰۔ عبدالرزاق،المصنف، کتاب النکاح ، باب الکفیل فی نفقۃ المراۃ

۵۱۔ ایضاً، باب اذا طلقھا ثلاثا ثم تزوجت بعد العدۃ زوجا غیرہ فلم یمسھا

۵۲۔ صحیح مسلم،زیر باب جرح العجماء الخ

۵۳۔ جامع الترمذی، کتاب الحدود ،باب ماجاء فی تحقیق الرجم

۵۴۔ ملاحظہ ہو: سورۃ النور ۲:۲۴

۵۵۔ جامع الترمذی، کتاب الحدود ،باب ماجاء فی تحقیق الرجم

۵۶۔ ایضاً،باب ماجاء فی المرتد

۵۷۔ صحیح مسلم،کتاب القسامۃ والمحاربین والقصاص والدیات

۵۸۔ حدیث میں ہے:من تطبب ولا یعلم منہ طب فھو ضامن .سنن ابی داؤد،کتاب الدیات ،باب فیمن تطبب

۵۹۔ جامع الترمذی ،کتاب الحدود ،باب تربص الرجم بالحبلیٰ حتی تضع

۶۰۔ صحیح مسلم، کتاب الحدود، باب من اعترف علی نفسہ الزنا

۶۱۔ اس مسئلہ میں فقہاء کے ہاں تفصیل ہے۔حدیث شریف میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مقتولہ حاملہ عورت جس کا جنین مردہ ساقط ہوا تھا، کے لیے غرہ (غلام/لونڈی کی قیمت) کا حکم صادر فرمایا تھا۔ملاحظہ ہو: نیل الاوطار از علامہ شوکانی ۷/۳،۷۴۔فتح الباری میں ہے کہ وجوب غرہ اس وقت ہے جب جرم کے اثر سے اپنی ماں کے پیٹ سے زندہ گرا اور باہر نکلتے ہی مر گیا تو اس صورت میں قصاص ہوگا یا دیت۔

۶۲۔ صحیح البخاری، کتاب النفقات، باب اذا لم ینفق الرجل فللمراۃ ان تاخذ بغیر علمہ ما یکفیھا وولدھا بالمعروف

۶۳۔ صحیح البخاری، کتاب الحدود ،باب کراھیۃ الشفاعۃ فی الحدود اذا رفع الی السلطان

۶۴۔ جامع الترمذی، کتاب الحدود، باب ماجاء فی درء الحدود

۶۵۔ صحیح البخاری، کتاب الرھن ،باب الخطاء والنسیان و قول النبی

۶۶۔ نیل الاوطار ۷/۶۱

۶۷۔ عبدالرزاق، المصنف ۹/۱۷۴۹۲

۶۸۔ صحیح البخاری، کتاب الدیات، باب قتل الرجل بالمرءۃ

۶۹۔ جامع الترمذی، کتاب الدیات، باب ماجاء فی دیۃ الاصابع

۷۰۔ ایضاً، باب ماجاء فی الموضحۃ

۷۱۔ ملاحظہ ہو: صحیح مسلم، کتاب الامارۃ ، باب وجوب طاعۃ الامراء

۷۲۔ صحیح مسلم، کتاب الیسر، باب ماجاء فی العذر، نیز: باب ماجاء ان لکل غادر لواء یوم القیامۃ

۷۳۔ ایضاً، باب ماجاء فی النھی عن قتل النساء والصبیان

۷۴۔ جامع الترمذی، کتاب السیر، باب سھم الخیل

۷۵۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب النھی عن طلب الامارۃ و الحرص علیھا

۷۶۔ ایضاً، باب فضیلۃ الامام العادل

۷۷۔ عبدالرزاق، المصنف ۸/۱۴۸، ۱۴۹

۷۸۔ سنن دار القطنی ۴/۲۰۵، نیز: المستدرک ۴/۹۴

۷۹۔ جامع الترمذی ۲/۲۸۸

۸۰۔ ایضاً، کتاب الاحکام، باب ماجاء لایقضی القاضی وھو غضبان

۸۱۔ ان چیزوں کی بیع کی حرمت کے لیے ملاحظہ ہو: صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ والمزارعۃ، باب تحریم بیع الخمر والمیتۃ والخنزیر والاصنام۔ نیز ان چیزوں کی وصولی کی حرمت کے لیے ملاحظہ ہو: جامع الترمذی، کتاب البیوع، باب ماجاء فی ثمن الکلب

۸۲۔ جامع الترمذی، کتاب البیوع، باب ماقیل فی شھادۃ الزور

۸۳۔ صحیح البخاری، کتاب الشھادات، باب ماقیل فی شھادۃ الزور

۸۴۔ مثلاً ملاحظہ ہو: صحیح البخاری، کتاب الشھادات، باب شھادۃ القاذف والسارق والزانی

۸۵۔ جامع الترمذی، کتاب الشھادات، باب ماجاء فیمن لا تجوز شھادتہ

۸۶۔ ایضاً، نیز: صحیح البخاری، کتاب الشھادات، باب شھادۃ الاماء والعبید

۸۷۔ جامع الترمذی، کتاب الجھاد، باب ماجاء لاطاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق

۸۸۔ ایضاً

☆☆☆☆
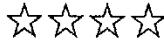
ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت شارع و مقنّن

اسلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شارع اور مقنن ہونا ایک قطعی اور مسلّمہ حقیقت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقِ تشریع و تقنین کو قرآن کریم نے کئی جہتوں سے بیان کیا ہے۔ مثلاً:

۱۔ جملہ اختلافات ونزاعات میں آپ کی اطاعت ضروری ہے

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا[النساء ۴:۶۵]

نہیں، قسم ہے آپ کے رب کی! یہ لوگ مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے تنازعات میں آپ کو حکم و منصف نہ مان لیں اور پھر جو فیصلہ آپ فرما دیں اس کے بارے میں کوئی تنگی دل میں محسوس نہ کریں بلکہ اسے پوری طرح دل سے تسلیم کریں۔

۲۔ آپ محرِّم و مبیح ہیں

يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلٰلَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ [الاعراف ۷:۱۵۸]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں اچھائی کا حکم دیتے ، برائی سے روکتے ، پاکیزہ چیزوں کو ان کے لیے حلال کرتے ، ناپاک چیزوں کو اُن پر حرام ٹھہراتے ، ان کے سر کا بوجھ ہلکا کرتے اور گردنوں کی زنجیر جو ان پر تھی ، کھولتے ہیں۔

۳۔ آپ مطاع مطلق ہیں

وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ [الحشر ۵۹:۸]

رسول تمہیں جو دیں اسے لے لو اور وہ جس سے روک دیں اس سے باز آجاؤ اور اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے۔

۴۔ آپ مطاع مستقل ہیں

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا [النساء ۴:۵۹]

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اولوالامر کی بھی۔ ہاں اگر کسی معاملہ میں اختلاف ہو جائے تو پھر اسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو۔ یہی ایک صحیح طریق کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔

۵۔ آپ مبیّنِ احکام وشارح قرآن ہیں

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ

يَتَفَكَّرُوْنَ [النحل۱۶:۴۴]

اور ہم نے آپ پر کتاب نازل کی تاکہ آپ لوگوں کے سامنے اس کی اچھی طرح تشریح اور وضاحت کر دیں تاکہ لوگ اس پر غور کریں۔

نیز فرمایا:

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ [النحل۱۶:۶۴]

اور ہم نے آپ پر کتاب صرف اس لیے نازل کی ہے کہ جس معاملہ میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں آپ اس کی وضاحت فرما دیں اور یہ اہل ایمان کے لیے ہدایت ورحمت ہے۔

۶۔ آپ کی رائے واجتہاد قطعی ہے

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ [النساء۴:۱۰۵]

(اے رسول!) ہم نے آپ پر یہ کتاب حق وصداقت کے ساتھ نازل کی ہے تاکہ آپ اس ہدایت ورہنمائی کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا کی ہے(۱)۔

۷۔ آپ کی اطاعت، اطاعتِ خداوندی ہے

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ

[النساء۴:۸۰]

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے دراصل اللہ کی اطاعت کی۔

۸۔ آپ کی اطاعت مدارِ ایمان ہے

فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ

[النساء۴:۶۵]

نہیں! قسم ہے آپ کے رب کی، یہ لوگ مومن نہیں ہوسکتے جب تک اپنے تنازعات میں آپ کو حکم ومنصف نہ مان لیں۔

۹۔ آپ کا کلام وحی الٰہی ہے

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى. اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى

[النجم ۵۳:۴]

اور نہ وہ اپنی خواہش نفسانی سے باتیں بناتے ہیں۔ ان کا کلام تو تمام تر وحی ہی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے۔

۱۰۔ آپ کے قضایا کی تقلید ضروری ہے

مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ [الاحزاب ۳۳:۳۶]

اور کسی مومن مرد اور مومن عورت کو حق نہیں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول کوئی امر مقرر کردیں تو وہ اس کام میں اپنا بھی کچھ اختیار سمجھیں۔

۱۱۔ احکامِ رسول کی خلاف ورزی کی ممانعت

فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ [النور ۲۴:۶۳]

جو لوگ احکامِ رسول کی خلاف ورزی کرتے ہیں انہیں ڈرنا چاہیے کہ وہ کسی آزمائش میں مبتلا ہوں یا انہیں دردناک عذاب پہنچ جائے۔

۱۲۔آپ کے احکام کی خلاف ورزی کو کفر قرار دیا

قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْکٰفِرِیْنَ [آل عمران ۳۲:۳]

آپ فرما دیں کہ اللہ کی اطاعت کرو اور اگر پھر جاؤ گے تو اللہ تعالیٰ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔

مندرجہ بالا آیاتِ مبارکہ سے بطورِ شارع ومقنن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت سے متعلق مختلف حیثیتوں کا تعین ہوتا ہے۔ان میں سب سے اہم حیثیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایسے حکم اور قاضی ہونے کی ہے جس کا فیصلہ قطعی اور یقینی ہوتا ہے جسے نہ صرف تسلیم کرنا ہوگا بلکہ اس کے قبول وانکار پر ایمان کا دارومدار ہے۔فیصلہ کو قبول بھی اس طرح کرنا ہوگا کہ دل میں کسی قسم کا انقباض اور تنگی بھی محسوس نہ ہو بلکہ پوری خوش دلی اور انشراح صدر کے ساتھ فیصلہ کو تسلیم کرے۔

سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۷ میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ کسی چیز کو حلال اور حرام قرار دینے کا اختیار بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہے۔

سورۃ الحشر کی آیت مبارکہ اور سورۃ النساء کی مذکورہ دونوں آیات نے امت مسلمہ کو اس بات کا پابند کر دیا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر حکم پر دل وجان سے عمل کریں اور جس بات سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منع فرما دیں اس سے باز رہیں۔یوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو بلا چون وچرا واجب قرار دیا گیا، بلکہ آپ کی اطاعت ہی کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کہا گیا۔ان آیات پر غور کرنے سے اس بات کے واضح دلائل ملتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ امت مسلمہ کو مستقل قانون عطا فرمائیں اور اللہ تعالیٰ نے جو احکام وقوانین نازل

کیے ہیں ان کی تعبیر وتشریح بھی فرمائیں۔

ان آیات کی بنیاد پر امت مسلمہ نے بالا جماع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قانون عطا کرنے والا تسلیم کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول، فعل اور تقریر بالاتفاق حجت ہے۔ قول، فعل اور تقریر کا مجموعہ ہی سنّت کہلاتا ہے۔ السنة ما صدر عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم غیر القرآن من قول أو فعل أو تقریر (۲)۔ سنّت کا اطلاق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل اور تقریر پر ہوتا ہے۔ تقریر یہ ہے کہ آپ نے صحابہ کرامؓ کو کچھ کہتے یا کرتے دیکھا اور اس پر خاموشی اختیار فرمائی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت شارع ومقنن

احادیثِ نبوی سے استشہاد

۱۔ سنّت، قرآن کی طرح محرِّم و مُبیح ہے

حضرت مقداد بن معدیکربؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ألا انی أُوتیتُ الکتاب ومثله معهٔ (۳)

مجھے کتاب دی گئی ہے اور اس جیسی ایک چیز اور بھی۔

مذکورہ حدیث میں سنّت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کی مثل (محرِّم و مبیح، آمر وناہی) بتایا گیا ہے۔

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مُبیح اور محرِّم ہیں

حضرت مقدادؓ ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الا یوشِكُ رجلٌ شبعانُ علی اریکتِهٖ یقول علیکم بهذا القرآن فما وجدتّم فیه من حلال فأَحِلُّوه وما وجدتم فیه من حرام فحرِّموه وانما حرّم رسول اللّٰه کما

حرم اللّٰه (۴)۔

عین ممکن ہے کہ تم میں سے ایک شکم سیر اپنی مسند پر ٹیک لگائے کہے یہ اللہ کی کتاب ہے۔ اس میں جو چیز حلال پاؤ اسے حلال سمجھو اور جسے حرام پاؤ اسے حرام تصور کرو، حالاں کہ اللہ کا رسول بھی ویسے ہی حرام ٹھہراتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ۔

۳۔ سنّت قرآن کی طرح منزّل من اللہ ہے

عن حسان بن عطية قال كان جبرئيل ينزل على رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم بالسنة كما ينزل عليه بالقرآن ويعلمه اياها كما يعلمه القرآن (۵)۔

حسان بن عطیہؒ مرسلاً روایت کرتے ہیں کہ جبرئیلؑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سنّت لے کر آئے تھے جیسے آپ پر قرآن لائے تھے اور اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح سکھاتے جس طرح قرآن کریم سکھاتے تھے۔

۴۔ سنّت کی طرف رجوع کا حکم

حدیث حضرت معاذؓ میں ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا: آپ فیصلہ کیسے کریں گے؟ حضرت معاذؓ نے عرض کیا: کتاب اللہ کی روشنی میں۔ فرمایا: اگر اس میں موجود نہ ہو تو پھر؟ عرض کیا: سنّتِ رسول کے مطابق (۶)۔

اس حدیث سے یہ حقیقت الم نشرح ہو جاتی ہے کہ حدیث میں ایسے احکام بھی مندرج ہوتے ہیں جو قرآن میں نہیں ہیں۔

صحابہ کرامؓ کے آثار وتعامل سے استشہاد

قرآن وسنّت کے ان قطعی نصوص کے پیشِ نظر، صحابہ کرامؓ بھی رسول اکرم صلی

اللہ علیہ وسلم کے تشریعی مقام سے متعلق واضح تصور رکھتے تھے، بنا بریں صحابہ کرامؓ نے آپ کی سنت کو تشریعی اور دستوری حیثیت دی۔ مؤرخین اور سیرت نگار حضرات لکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس بارے میں صاف اعلان فرمایا:

> ''لوگو! جب تک میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کروں، اس وقت تک تم پر میری اطاعت ضروری ہے۔ ہاں اگر میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت سے انحراف کروں تو پھر تم پر میری اطاعت کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی''(۷)۔

مہران بن میمونؒ کی روایت ہے جس میں وہ خاص طور پر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے تشریعی اسلوب کی وضاحت کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا طریق کار یہ تھا کہ جب کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو یہ دونوں خلفاء پہلے قرآن کریم کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اگر قرآن کریم میں اس کا حل مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ کر دیتے اور اگر قرآن حکیم اس معاملہ میں خاموش ہوتا تو پھر سنت رسول علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کی طرف رجوع کرتے اور سنت کے مطابق فیصلہ فرماتے۔ اگر اپنے علم کی حد تک ان دونوں سے کوئی حل نہ ملتا تو پھر مسجد نبوی میں صحابہ کرامؓ کو جمع کیا جاتا اور ان سے پوچھا جاتا کہ زیرِ غور مسئلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی حکم یا کوئی قول اگر کسی کے علم میں ہو تو وہ بتائے تاکہ اس کے مطابق فیصلہ کر دیا جائے۔ اگر اس سلسلہ میں کسی کے پاس کوئی حدیث موجود ہوتی یا سنت کی کوئی رہنمائی کسی کے علم میں ہوتی تو وہ اسے پیش کر دیتا اور اس کے مطابق فیصلہ کر دیا جاتا تھا۔ ہاں اگر کسی کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت موجود نہ ہوتی تو پھر باہم غور و فکر اور مشورہ سے جو طے پاتا اس کے مطابق فیصلہ کر دیا جاتا(۸)۔

حضرت عمرؓ کا طرزِ عمل اپنے تمام دورِ خلافت میں یہی رہا، بلکہ انہوں نے اپنے

گورنروں اور قاضیوں کو بھی باقاعدہ ہدایات جاری فرمائی تھیں کہ وہ کتاب اللہ اور سنّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق فیصلے کیا کریں۔ حضرت عمرؓ کا حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے نام ایک مشہور خط ہے جس میں انہوں نے نظام قضاء کے اصول بیان فرمائے ہیں۔اس خط میں سب سے مقدم ہدایت یہ ہے کہ جب کوئی مقدمہ پیش ہوتو اس کا فیصلہ قرآن کریم کے مطابق کیا جائے، اگر قرآن کریم میں اس سے متعلق کوئی حکم موجود نہ ہوتو پھر سنت طیبہ سے رہنمائی حاصل کی جائے اور اس کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ اگر قرآن و سنّت میں کوئی حکم نہ ملے تو پھر قرآن وسنّت میں جو اشباہ ونظائر موجود ہیں انہیں سامنے رکھ کر قیاس واستدلال سے کام لیا جائے(۹)۔

حضرت عمرؓ نے اپنے دور کے مشہور قاضی شریحؒ کو بھی ہدایت جاری کی کہ قرآن وسنّت پر سختی سے عمل کیا جائے اور اپنے تمام فیصلوں میں قرآن وسنت کو بنیادی مآخذ کے طور پر استعمال کیا جائے(۱۰)۔

صحابہ کرامؓ کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق تشریع وتقنین کا اندازہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی اس اصولی ہدایت سے بھی لگایا جاسکتا ہے جو آپ نے ججوں کو جاری فرمائی تھی:

من عرض له منكم قضاء بعد اليوم فليقض بما في كتاب اللّٰه، فإن جاء أمر ليس في كتاب اللّٰه فليقض بما قضى به نبيه، فإن جاء أمر ليس في كتاب اللّٰه ولا قضى به نبيه ولا قضى به الصالحون فليجهتد رايه (۱۱)۔

آج کے بعد جو بھی عہدہ قضا پر فائز ہوتو اسے چاہیے کہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرے۔ اگر ایسا معاملہ پیش آئے جس کے بارے میں کتاب اللہ میں کچھ نہ ملے تو پھر سنّت رسول اللہ کے مطابق فیصلہ

کرے اور اگر ایسا مسئلہ پیش آ جائے جس کے بارے میں سنّت میں بھی کچھ نہ ملے تو پھر صلحاءِ امت کے فیصلوں کو دیکھے، اگر اس میں رہنمائی ہو تو اس کے مطابق فیصلہ کرے۔ اگر یہ سب زیرِ غور مسئلہ کے بارے میں خاموش ہوں تو پھر اپنی رائے سے اجتہاد کرے۔

صحابہ کرامؓ نے اپنے دور میں بہت سے قانونی فیصلے کیے جن میں حدیث نبوی ہی اصل بنیاد ہے۔ مثلاً حضرت ابوبکرؓ نے عام قانون کے برعکس پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت تقسیم نہیں فرمائی، اس لیے کہ حدیث ہے:

نحن معاشر الانبیاء ماترکناہ صدقة (۱۲)

ہم انبیاء کی جماعت ورثاء کے لیے مال نہیں چھوڑتے، ہمارا تمام ترکہ صدقہ ہوتا ہے۔

اسی طرح حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی روایت کی بنیاد پر دادی کو وراثت میں چھٹا حصہ دلوایا (۱۳)۔ حضرت عثمانؓ نے حضرت فریعہ بنت مالکؓ کی روایت کی بنیاد پر یہ فیصلہ فرمایا کہ وہ خاتون جس کے شوہر کا انتقال ہو جائے، اپنے شوہر کے گھر ہی عدت گزارے گی (۱۴)۔

کتبِ فقہ میں اس قسم کے بہت سے فروعی احکام ملتے ہیں جنہیں صحابہ کرامؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول یا فیصلہ کی بناء پر قانونی شکل دی ہے۔

اسلامی قانون سے چند عملی نظائر

مناسب ہوگا اگر اسلامی قانون سے کچھ مثالیں یہاں بیان کر دی جائیں جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شارع و مقنن ہونے کی حیثیت مزید واضح ہوتی ہے:

۱۔ شریعتِ اسلامیہ میں ایسے بہت سے احکام موجود ہیں جو صرف سنّت طیبہ سے ثابت ہیں، قرآن کریم میں یہ احکام موجود نہیں ہیں، مثلاً:

☆ رجم کی سزا قرآن کریم کی مقرر کردہ نہیں ہے، یہ سنّت ہی سے ثابت ہے اور تمام فقہاء رجم کو بطورِ حد قبول کرتے ہیں۔

☆ مردوں کے لیے سونے اور ریشمی کپڑے کا استعمال حرام قرار دیا گیا ہے۔ ان کی حرمت مردوں کے حق میں سنّت مطہرہ سے ثابت ہے۔

☆ صدقہ کا وجوب، عاقلہ پر دیت عائد کرنا، حالتِ حضر میں رہن کا جواز غیرہ سب احکام سنّت سے ثابت ہیں۔

☆ دنیائے اسلام میں اذان کا یکساں طریقہ مسلمانوں میں رائج ہے۔ حجاز مقدس سے لے کر کابل تک اور مراکش سے انڈونیشیا تک ہر جگہ ایک ہی اذان بلند ہوتی ہے جو پانچ وقت دی جاتی ہے۔ بعض مسلم ممالک میں تہجد کے لیے بھی اذان دی جاتی ہے۔ اذان کا طریق کار، اس کے الفاظ اور کلمات بھی سنّت سے ثابت ہیں۔

☆ اپنی دعوت کے آغاز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اندیشہ شرک کے پیشِ نظر زیارتِ قبور سے منع فرما دیا تھا، بعد میں یہ کہہ کر اجازت دے دی:

كنت قد نهيتكم عن زيارة القبور الا فزوروها، فانها تذ كّركم الآخرة (١٥)

میں نے پہلے تمہیں زیارت قبور سے منع کر دیا تھا اب تم قبرستان جایا کرو اس لیے کہ قبرستان جا کر آخرت کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبرستان جانے سے منع کر دیا تھا اس وقت قبرستان جانا ممنوع تھا اور جب اجازت دے دی اور اس اجازت کی وجہ و علّت بھی بتا دی تو اب اس مقصد کے حصول کے لیے قبرستان جانا پسندیدہ عمل قرار پایا۔

☆ سنّت سے حمر اهلية (پالتو گدھوں) کی حرمت بیان ہوئی ہے۔ ایسے ہی ذی ناب سباع (چیر پھاڑ کرنے والے درندے) کی تحریم کا بیان صرف سنّت میں ہے،

قرآن میں نہیں ہے(۱۶)۔

☆سنّت ہی کی روشنی میں یہ اصول بیان کیا گیا ہے کہ چچی اور خالہ کے ساتھ اس کی بھتیجی اور بھانجی کو ایک نکاح میں جمع نہ کیا جائے (۱۷)۔

۲۔ قرآن کریم کی تعبیر وتشریح اور اس میں تخصیص کا اختیار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے۔کوئی دوسرا فرد نہ سنّت کے خلاف تشریح وتعبیر کرسکتا ہے اور نہ اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ قرآن کے عموم میں تخصیص یا مطلق کو مقید کر سکے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بطور شارع ومقنن حیثیت کی مزید وضاحت کے لیے اسلامی قانون سے کچھ مثالیں بیان کرنا ضروری ہیں تا کہ ان کی روشنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت زیادہ بہتر طریقہ پر سمجھی جا سکے۔قرآن کریم میں بہت سے احکام مجمل بیان ہوئے ہیں جن کی تفصیل وتشریح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے۔مثلاً:

☆ قرآن حکیم میں ارشاد ہے: ﴿اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ﴾ (نماز قائم کرو)۔اب قیامِ نماز کی تفصیلات وہی معتبر ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طے فرمادیں۔نمازوں کے اوقات، رکعتوں کی تعداد، قیام، رکوع وسجود کا طریق کار وغیرہ سب باتوں کا علم سنّت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوتا ہے۔

☆ روزہ کی فرضیت کے بارے میں قرآن کریم کا ارشاد ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ [البقرۃ ۲:۱۸۳]

اے ایمان والو! تم پر روزے اسی طرح فرض کیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تا کہ تم اہل تقویٰ بن جاؤ۔

روزوں سے متعلق احکام کی تفصیل بھی سنّت طیبہ میں ملتی ہے۔

☆ اسی طرح زکوٰۃ کا حکم تو قرآن کریم میں موجود ہے لیکن یہ تفصیلات کہ کون سے اموال پر زکوٰۃ فرض ہے اور کون سے اموال اس سے مستثنیٰ ہیں، سنّت طیبہ سے ملتی ہیں۔

۳۔ قرآن کریم کے عموم میں تخصیص کا حق بھی صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے۔ مثال کے طور پر قرآن حکیم میں عمومی حکم ہے کہ وراثت مرنے والوں کے جائز ورثا میں تقسیم ہوگی۔ لیکن اس عام حکم میں حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے تخصیص پیدا ہوگئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

لا یرث القاتل شیئا (۱۸)

قاتل کا وراثت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

اس حدیث کی بنا پر قرآن کریم کی آیت مبارکہ:

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِ كُمْ لِلذَّكَرِمِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ

[النساء ۴:۱۱]

اللہ تعالیٰ حکم دیتے ہیں اولاد کے بارے میں لڑکے کو دولڑکیوں کے برابر حصہ ملے گا۔

میں تخصیص پیدا ہوگئی ہے۔ اگر بیٹا باپ کا قاتل ہے تو اسے باپ کی وراثت میں کوئی حصہ نہیں ملے گا۔

اسی طرح سنّت نے مورث کی تخصیص کی کہ نبی اور رسول مورث نہیں بنتے (۱۹):

انا معشر الانبیاء لا نورث ماترکناه صدقة

انبیاء کی جماعت کسی کو وارث نہیں بناتی اوران کا ترکہ صدقہ ہے۔

۴۔ حکم مطلق کو مقید کرنے کی مثالیں بھی سنّت طیبہ میں ملتی ہیں، مثلاً قرآن

حکیم کا ارشاد ہے:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا [المائدة۵:۳۸]

چوری کرنے والا مرد اور چوری کرنے والی عورت دونوں کے

ہاتھ کاٹ دو۔

یہ آیت مطلق ہے اس میں دائیں یا بائیں ہاتھ کی کوئی قید نہیں، نہ یہ تعین ہے کہ کس جگہ سے کاٹا جائے۔عربی زبان میں لفظ ''ید'' کا اطلاق کاندھے سے انگلیوں تک سارے ہاتھ پر ہوتا ہے۔ یہ قید سنت سے ثابت ہوتی ہے کہ دایاں ہاتھ کلائی سے کاٹا جائے گا۔اصول فقہ میں اس قسم کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

۵۔ فقہاء کرام نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی اصولی ہدایات کی بنیاد پر قانون سازی فرمائی۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو ایسے جامع اصول عطا فرمائے ہیں جن کی بنیاد پر فقہی استنباط و استدلال کیا گیا۔ان اصولوں کو فقہی قواعد کلیہ کہا گیا ہے۔ذیل میں بطورِ مثال چند ایسے قواعد کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو لفظاً یا معنیً احادیث نبویہ سے ماخوذ ہیں:

☆**لاضرر ولاضرار**

نہ خود نقصان اٹھاؤ نہ دوسرے کو نقصان پہنچاؤ۔

یہ بعینہ حدیث کے الفاظ ہیں۔

☆**الحرام لایحرم الحلال**

کسی حرام کے ارتکاب سے کوئی حلال کام حرام نہیں ہوجاتا۔

یہ بھی حدیث کے الفاظ ہیں۔

☆**الخراج بالضمان**

فائدہ وہی اٹھائے جو تاوان دینے کا ضامن ہو۔

یہ بھی حدیث کے الفاظ ہیں۔اسی سے ملتا جلتا ایک اور قاعدہ کلیہ ہے:

الغرم بالغنم

نقصان منافع کے ساتھ ہے۔

☆**الحدود تندرأ بالشبهات**

حدود کی سزائیں شبہات کی وجہ سے ساقط ہو جاتی ہیں۔

یہ کلیہ حدیث نبوی سے ماخوذ ہے۔

☆**الامور بمقاصدها**

معاملات کا دارومدار ان کے مقاصد پر ہوتا ہے۔

یہ کلیہ اس حدیث سے ماخوذ ہے:

انما الاعمال بالنيات

بے شک اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔

☆**اليقين لايزول بالشک**

یقین کو محض شک کی بنا پر ختم نہیں کیا جا سکتا۔

☆**ماحرم اخذه حرم اعطاؤه**

جس چیز کا لینا حرام ہے اس کا دینا بھی حرام ہے۔

☆**الضرورات تبيح المحظورات**

ضرورتیں ممنوعات کو مباح کر دیتی ہیں۔

یہ قواعد احادیث سے ماخوذ ہیں (۲۰)۔ یہ وہ قواعد ہیں جنہیں فقہاء استنباط واستدلال میں ملحوظ رکھتے اور قانون سازی کا عمل ان قواعد کی روشنی میں آگے بڑھاتے ہیں۔

اجتہاد کا ثبوت

اسلامی قانون کی تعبیر وتشریح اور اس کے ارتقاء میں اجتہاد کو ایک اہم اور

بنیادی اصول کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ اصول بھی صراحتاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عطا کردہ ہے جو ہر دور اور ہر زمانہ میں قانون سازی کے عمل میں مدد و معاون ہوتا ہے۔ ایسے تمام مسائل جن میں قرآن و سنت خاموش ہوں، سنت کی رو سے اہلِ اجتہاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی تمام تر صلاحیتوں کو استعمال کر کے درپیش مسائل کا حل پیش کریں۔ اس علمی اور فکری ریاضت کا عمل تا قیامت جاری رہے گا۔

اجتہاد کا حکم قرآن حکیم میں صراحتاً نہیں ملتا، اگرچہ فقہاء نے بعض آیات سے ثبوتِ اجتہاد پر استدلال کیا ہے لیکن اگر اجتہاد کے ثبوت میں صریح احادیث اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل نہ ہوتا تو اجتہاد کو شاید اس طرح قبولیت حاصل نہ ہوتی۔ پھر اجتہاد کو اجتہاد ہی کے ذریعہ ثابت کرنا ایک کمزور دلیل پر مبنی ہوتا۔

اجتہاد کے ثبوت میں سب سے اہم حدیث، حدیث معاذ بن جبلؓ ہے (۲۱) جسے تمام مکاتب فقہ کے ائمہ نقل کرتے ہیں اور اسی پر اصولِ اجتہاد کی بنیاد رکھتے ہیں۔ یہ حدیث ابوداؤدؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ، دارمیؒ، ابن ماجہؒ اور امام احمد بن حنبلؒ نے نقل کی ہے۔ فقہائے احناف، مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے علاوہ امام اوزاعیؒ، سفیان ثوریؒ، لیث بن سعدؒ، حسن بصریؒ، محمد بن جریر طبریؒ بھی اجتہاد کو ایک اصول کے طور پر قبول کرتے ہیں۔ ان حضرات کے اجتہادات نے بھی فقہ اسلامی کے ارتقاء میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

اس حدیث کا اہم پہلو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کرامؓ کو اجتہاد کا حکم اس وقت دیا تھا جب اجتہاد کی واقعی ضرورت تھی۔ ۵ ہجری میں جب حضرت معاذؓ کو یمن میں انتظامی اور عدالتی ذمہ داریاں دے کر روانہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں درپیش مسائل کا حل اجتہاد کے ذریعہ تلاش کرنے کی اجازت عطا فرمائی۔ اس واقعہ کا سیاق و سباق اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ اجتہاد کا عمل اس وقت جاری ہوگا جب حقیقتاً اجتہاد کی ضرورت پیش آئے گی۔

امام ابوداؤدؒ نے اپنی کتاب السنن میں حدیثِ حضرت معاذ بن جبلؓ نقل کرنے کے لیے یہ باب قائم کیا ہے: باب اجتهاد الرأی فی القضاء ۔ اس باب کے اسلوب سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے کبار محدثین کے نزدیک عدلیہ کے جج اور قاضیوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ معاملات کا فیصلہ کرنے میں اپنی عقل ذہانت سے بھرپور کام لیں اور اجتہاد کے ذریعہ معاملہ کی حقیقت جاننے کی کوشش کریں۔ اجتہاد کے ثبوت میں دوسری حدیث حضرت عمرو بن العاصؓ سے مروی ہے جسے صحاح ستہ کے تمام محدثین نے نقل کیا ہے:

اذا حكم الحاكم فاجتهد فأصاب فله اجران، واذا حكم فاجتهد فا خطأ فله أجر (۲۲)

جب کوئی حاکم فیصلہ کرتا ہے اور فیصلہ سے قبل زیر غور مسئلہ میں اجتہاد کرتا ہے اور صحیح نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے تو اسے دگنا اجر ملتا ہے اور اگر اجتہاد کے ذریعہ کسی فیصلہ تک پہنچنے کی کوشش تو کرتا ہے لیکن اس سے غلطی سرزد ہو جاتی ہے تو بھی اسے ایک اجر ضرور ملتا ہے۔

انسان خواہ کتنا ہی صاحبِ علم و ذہانت اور صاحبِ تقویٰ ہو، اس سے غلطی کا امکان ہے، جیسا کہ اس حدیث سے پتہ چلتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی فرد حتمی حجت نہیں ہے۔ اہل علم کو اپنی رائے پر بلا وجہ اصرار نہیں کرنا چاہیے اور جب زیادہ قوی رائے آ جائے اسے قبول کرنے میں جھجک محسوس نہیں کرنا چاہیے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت اور آپ کی مجموعی تعلیمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے فقہاء نے اجتہاد کے مختلف اسالیب پر بحث کی ہے جن میں نمایاں اسالیب قیاس، استحسان، استدلال، مصالح مرسلہ، ذرائع (فتح الذرائع اور سدالذرائع) اور اعتبارِ عرف وعادات ہیں (۲۳)۔

اجتہاد کے باب میں ایک اور اہم اصول سنتِ طیبہ میں ملتا ہے جس پر خلفاء راشدین نے اپنے دورِ خلافت میں عمل کیا، وہ یہ تھا کہ اگر کسی فرد کو ذاتی مسئلہ پیش آ جائے اور وہ خود مجتہد نہ ہو تو کسی صاحبِ علم سے پوچھ لے اور اگر خود درجہ اجتہاد پر فائز ہے تو اجتہاد کر سکتا ہے، لیکن لوگوں کے اجتماعی معاملے میں مشاورتی اجتہاد ہی کو ترجیح حاصل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے عہد میں جب بھی کوئی ملّی مسئلہ درپیش ہوا اور اس کے بارے میں وحی خاموش تھی تو اسے مشاورتی اجتہاد کے ذریعے حل کیا گیا۔ قبیلہ ہوازن کے جنگی قیدیوں کی رہائی کا مسئلہ ہو یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی کا، عراق کی زمینوں کا مسئلہ ہو یا جمع وتدوین قرآن کا، ایسے سارے مسائل کے حل کے لیے اجتماعی یا مشاورتی اجتہاد ہی پر بھروسہ کیا جاتا تھا۔

اس بحث کی روشنی میں یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شارع ومقنن کی حیثیت مسلّمہ اور دستوری ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیا ہوا ہر فیصلہ، حکم، قاعدہ اور ضابطہ پوری امت کے لیے واجب العمل ہے۔ کسی فرد، جماعت اور ادارے کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ آپ کے کسی حکم یا فیصلہ کو منسوخ کر دے یا اس میں ترمیم کرے۔

آخر میں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ رسالت کے پہلو کو مختصراً اجاگر کر دیا جائے، اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شارع اور مقنن ہونے کا جو مقام ومرتبہ حاصل ہے وہ بحیثیت رسول ہے۔ رسالت ہی وہ مقام ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انسانوں سے ممتاز ونمایاں کرتا ہے۔ آپ بحیثیت رسول ہمارے ایمان کا حصہ ہیں۔ اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ آپ کے ہر قول، فعل اور حکم اور فیصلہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر کے اسے بلا چون و چرا تسلیم کیا جائے۔ کسی دوسرے فرد کو یہ مقام حاصل نہیں ہو سکتا کہ اس کا قول وفعل اس طرح حجت بن جائے کہ اس پر اعتراض نہ اٹھایا جا سکے۔ یہ مقام صرف اس ہستی کو حاصل ہو سکتا ہے جو دین وشریعت کے ابلاغ اور اس کی تشریح وتعبیر میں معصوم عن الخطاء

ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰی

[النجم ۵۳:۳،۴]

رسول صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ کہتے ہیں وہ اپنی خواہش سے نہیں کہتے
بلکہ وہ اللہ رب العالمین کی جانب سے وحی کی بنیاد پر کہتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مرکز ایمان بھی ہیں اور مرکز محبت بھی۔ آپ کا ارشاد ہے:

لا یومن احد کم حتی اکون احب الیه من والده و ولده
والناس اجمعین

تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں
اس کے والدین، اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوں۔

لہذا صرف ایمان ہی کا تقاضا نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی جائے بلکہ محبت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات اور آپ کے اسوۂ حسنہ کی جذبۂ شوق ومحبت کے ساتھ پیروی کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کا اظہار بھی اطاعتِ رسول کی صورت میں ہوتا ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ
وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ [آل عمران ۳:۳۱]

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم!) آپ انہیں بتا دیجئے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ
سے محبت کرتے ہو تو پھر میری اتباع کرو اللہ تعالیٰ تمہیں اپنا محبوب
بنالے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کردے گا۔

رسالت کے اس پہلو پر غور کریں تو آپ کی حیثیتِ شارع ومقنن خوب واضح

ہوجاتی ہے۔اب اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شارع تسلیم کرکے آپ کی اطاعت بھی تسلیم و رضا کے ساتھ کی جائے، ورنہ زندگی بھر کے اعمال بے کار ہوجائیں گے۔

يَـاَيُّهَاالَّـذِيـنَ اٰمَـنُـوْا اَطِيـعُـوااللّٰهَ وَاَطِيعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ [محمد ۴۷:۳۳]

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو ضائع نہ کرو۔

حوالہ جات

۱۔ علمائے اصول نے بما اراک اللہ سے استدلال کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد اور رائے بمنزلہ وحی جلی اور نص صریح کے ہے، کیوں کہ اگر کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے اور اجتہاد میں کوئی خطا واقع ہوئی تو فوراً بذریعہ وحی اس پر مطلع کر دیا جاتا۔قال القرطبی قوله تعالیٰ بما اراک الله معناه علی قوانین الشرع وهو يدل علی ان النبی صلی الله عليه وسلم اذا رأی شيأً اصاب لان اللّٰه تعالیٰ اراه ذلک الخ. القرطبی، احکام القرآن، بیروت، دار العربی ۲۰۰۰ء، ۳۵۸/۵

۲۔ آمدی، علی بن محمد، الإحکام فی اصول الأحکام ، بیروت، دار الکتاب العربی، طبعہ ثالثہ، ۱۹۹۸ء، ۲۲۳/۴

۳۔ ابوداؤد ، کتاب السنة، رقم ۴۶۰۴

۴۔ ایضاً

۵۔ دارمی، ، سنن الدارمی، کتاب، ابواب متفرقة فی صفات النبی وفی العلم و نحوها، باب السنة قاضية علی کتاب الله

۶۔ ترمذی، الجامع الصحیح ، کتاب الاحکام، باب ما جا فی القاضی کیف یقضی

۷۔ ابن ہشام، السیرة النبویة، مکتبہ جمہوریہ، قاہرہ، ج ۴، ص ۴۵۷

۸۔ دارمی، سنن الدارمی ،دارالمکتب العلمیہ، بیروت، ج۱ص ۵۸

۹۔ ماوردی، الاحکام السلطانیة،مطبع المعارف، قاہرہ ۱۳۳۲ھ ص۷۱۔ وکیع، اخبار القضاة، عالم الکتب، بیروت، ج ۱ص ۸۴

۱۰۔ دارمی، السنن، ج ۱ص ۶۰

۱۱۔ شاطبی، الموافقات فی اصول الشریعة، دارالمعرفة، بیروت، ج ۴ص ۸

۱۲۔ شوکانی، نیل الاوطار، ج ۶ص ۶۷ (یہ روایت متفق علیہ ہے)۔

۱۳۔ شوکانی، نیــل الاوطــار، ج ۲ص ۵۹ (یہ روایت، ترمذی، ابن ماجہ اور احمد بن حنبل نے نقل کی ہے)۔

۱۴۔ نیل الاوطار، ۲۹۸/۶ (یہ روایت احمد بن حنبل، نسائی، ترمذی اور ابوداؤد نے نقل کی ہے)۔

۱۵۔ ابوداؤد، السنن، کتاب الجنائز، باب فی زیارة القبور

۱۶۔ الموافقات، ج ۴ص ۱۶

۱۷۔ الاستقراء دل علی أن فی السنه أشیاء لا تحصی کثرة، لم ینص علیها فی القرآن، کتحریم نکاح المرأة علی عمتها أو خالتها وتحریم الحمر الأهلیة و کل ذی ناب من السباع۔ شاطبی، الموفقات فی اصول الشریعة، بیروت، دارالمعرفة، ج ۴ص ۱۶

۱۸۔ ابوداؤد، السنن، کتاب الدیات، باب:۲۱

۱۹۔ بخاری، الجامع الصحیح، ج ۴ص ۹۶، ۹۷، ۹۸۔ نیز کنز العمال: ۱۸۷۶۸

۲۰۔ عبدالعزیز العلی النعیم، اصول الاحکام الشرعیة، جامعة الریاض، ص ۱۶۱ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے، غازی محمود احمد، قواعد کلیہ اور ان کا آغاز وارتقاء (شریعہ اکیڈمی، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء) ص ۸۱۷

۲۱۔ ابوداؤد، السنن، کتاب القضاء، ج ۳ص ۷۸

۲۲۔ ایضاً

۲۳۔ تفصیلات کے لیے دیکھئے رسالہ ”مناہج واسالیب اجتہاد“ (شریعہ اکیڈمی، اسلام آباد)

☆☆☆☆

ڈاکٹر محمود احمد غازی

رسول اکرم علیہ السلام اور قانون بین الممالک

(ہجرتِ حبشہ اور میثاقِ مدینہ کی روشنی میں)

اسلام کا مفہوم چند عبادات و معاملات کے احکام تک محدود نہیں ہے بلکہ اسلام کے پیغام کی وسعتیں کائنات کی ساری جہتوں کو محیط ہیں۔ اسلام کی تربیت کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ مسلمان کسی محدود جغرافیائی، علاقائی، لسانی یا ثقافتی نظریہ کے علمبردار نہ بنیں بلکہ وہ اسلام ہی کے عالمگیر، بین الانسانی اور آفاقی تصور کے علمبردار بن کر رہیں اور کسی تنگ اور محدود نسبت سے اپنے ملّی اور ثقافتی وجود کو آلودہ نہ کریں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ نے اپنے لیے کسی علاقائی عنصر یا شناخت کو پہچان کا ذریعہ نہیں بنایا۔ قرآن پاک نے علاقائی وابستگی محض وجہِ تعارف قرار دی ہے۔ ایک شخص کے تعارف کے لیے بعض اوقات یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ یہ بتایا جائے کہ وہ سرائیکی علاقے سے تعلق رکھتا ہے یا پوٹھوار کے علاقہ سے، وہ پنجابی زبان بولتا ہے یا وہ پشتو بولنے والے علاقے سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن اس تعارف کی بنیاد پر یہ درست نہیں ہوگا کہ کوئی امت کھڑی کر لی جائے، یا اس تعارف کی بنیاد پر عدل و انصاف کا کوئی ایسا نظام قائم کر لیا جائے جس سے استفادہ کے حقوق کسی خاص رنگ یا نسل کے لوگوں ہی کو حاصل ہوں، یا کوئی ایسا نظام بنا لیا جائے جس سے اسلام کی عالمگیریت کو نقصان پہنچے یا بین الاقوامی سطح پر اس تعارف کی وجہ سے اسلام کا اجتماعی اور ملّی کردار مجروح ہو جائے، ان تمام چیزوں کی

اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ عرب تھے اور قبیلہ قریش سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن جب بھی آپ کو یا آپ کی موجودگی میں کسی اور کو اس حسب ونسب یا لسانی یا جغرافیائی نسبت سے اس انداز سے منسوب کیا گیا کہ اس سے امت کی عالمگیر وابستگی پر زد پڑتی ہو تو آپ نے اسے پسند نہیں کیا۔ حضرت کعب بن زہیرؓ کا مشہور واقعہ آپ کے سامنے ہے۔ وہ جب اپنا مشہور قصیدہ حضور علیہ السلام کے روبرو پڑھ رہے تھے تو ایک جگہ انہوں نے حضور علیہ السلام کو تلوار سے تشبیہ دی۔ ان دنوں عرب میں ہندی تلواروں کی مضبوطی کی بہت شہرت تھی، کسی بھی جنگجو کی بہادری کو بیان کرنے کے لیے اسے ہندی تلواروں سے تشبیہ دی جاتی تھی۔ اسی انداز کی پیروی کرتے ہوئے صحابی شاعر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہادری بیان کرتے ہوئے کہا:

ان الرسول لنور يستضاء به

و سيف من سيوف الهند مسلول(۱)

یعنی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسا نور ہیں جس سے چہار سو روشنی حاصل کی جاتی ہے۔ وہ ہندوستان کی تلواروں میں ایک ایسی تلوار ہیں جو راہ خدا میں بلند کی گئی ہے۔

اس شعر میں شاعر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سیوف الہند سے تشبیہ دی جسے آپ نے پسند نہیں فرمایا اور فرمایا سیوف الہند کے بجائے سیوف اللہ کہو(۲)۔ ہندی تلوار سے تشبیہ صرف اس بنا پر ناپسند فرمائی کہ آپ کی عالمگیر رسالت کو کسی علاقائی نسبت سے نہیں بلکہ رب کائنات کے ساتھ تعلق کے عالمگیر حوالہ سے دیکھا جائے۔

جیسا کہ اسلامی تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ مکرمہ میں دعوت دین کا آغاز فرمایا تو مکہ مکرمہ ہی میں روز اوّل ہی سے ایک ایسی امت کی تشکیل پر توجہ دی جو اپنے عقائد، اطوار، قوانین واحکام، غرض ہر چیز میں دوسری

اقوام سے بالعموم اور قریش مکہ سے بالخصوص ایک ممتاز اور ممیّز حیثیت رکھتی تھی ۔ بہت جلد یہ مسلم جماعت ایک منفرد تنظیم کی حیثیت اختیار کر گئی جس کی سربراہی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں تھی ۔ یہ وہ جماعت تھی جو اپنے روزمرّہ انفرادی معاملات سے لے کر اجتماعی معاملات تک، یعنی خاندانی معاملات میں، لوگوں سے لین دین میں، مسلم اور غیر مسلم سے تعلقات کی نوعیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جملہ ہدایات وتعلیمات کی پیروی کرتی تھی ۔ اگر رومن قانون کی اصطلاح استعمال کرنے کی اجازت دی جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک Imperium in imperio تھی ، یعنی مسلمانوں کی یہ تنظیم ایک طرح سے ریاست کے اندر ریاست کی حیثیت رکھتی تھی ۔ ایک ایسی کمیونٹی جو اپنے سے باہر کے رائج الوقت نظام سے کٹ کر خود اپنے ایک اندرونی نظام کی پیروکار اور اس کی علمبردار تھی ۔ اس اعتبار سے اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ مسلمانوں کے قانون بین الممالک کا آغاز مکہ مکرمہ ہی میں ہو چکا تھا ۔ مکہ مکرمہ میں قریش اور مشرکین عرب سے مسلمانوں کے تعلقات کی نوعیت کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات پورے اعتماد سے کہی جا سکتی ہے کہ مسلمانوں کے بین الاقوامی تعلقات کی ابتداء مکہ مکرمہ سے ہی ہو گئی تھی ۔

مکہ مکرمہ کے قرب و جوار میں بسنے والے قبائل سے حضور علیہ السلام کے تعلقات کی تفصیلات سیرت طیبہ کی کتابوں میں ملتی ہیں ۔ ان تعلقات سے پتہ چلتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے مسلمانوں کے تعلقات ایک منفرد قوم کی حیثیت سے دوسری اقوام سے قائم کیے ۔ دوسری اقوام وقبائل سے معاہدات کی کوششیں بھی قیام مکہ کے دوران ہی شروع کر دیں اور بعض قبائلی سرداروں سے بین القبائلی نوعیت کی بعض مفاہمتیں بھی ہوئیں ۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عرب کے مختلف قبائل سے اس قسم کے بین الاقوامی اور بین القبائلی روابط بڑھتے چلے گئے جو یقیناً مسلم بین الاقوامی تعلقات کی خشتِ اوّل قرار دیے جا سکتے ہیں ۔ اگر آپ ان گفتگوؤں اور مذاکرات کی تفصیلات ذہن میں تازہ

فرمائیں جو حضور علیہ السلام نے قیام مکہ مکرمہ کے آخری تین سالوں میں حج کے موقعہ پر مکہ مکرمہ آنے والے مختلف عرب قبائل سے کیے، خاص طور پر مدینہ منورہ سے آنے والے اوسیوں اور خزرجیوں سے جو مذاکرات کیے گئے اور ان سے جو معاہدات کیے جو بیعت عقبہ اولیٰ اور ثانیہ کے نام سے مشہور ہیں، ان کی تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خالصتاً بین الاقوامی نوعیت کے معاملات ہیں جن میں جہاں امن اور صلح کی تفصیلات موجود ہیں، وہاں جنگ کی صورت میں فریقین کی ذمہ داریاں بھی بیان کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ نبوت کے چند ہی سال بعد آپ نے عرب سے باہر بھی سفراء بھیجنے کا آغاز فرمادیا تھا۔ حضور علیہ السلام نے صحابہؓ کی جماعت کو حبشہ بھیجا جس میں شاہِ حبشہ کے نام ایک خط بھی روانہ فرمایا(۳)۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ اسلام کے بین الاقوامی بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں بین البراعظمی تعلقات کا آغاز تھا۔ براعظم افریقہ کے ایک فرمانروا کے نام ایک تحریر لکھی جارہی تھی جس میں اس آئین بین الاقوام کی بنیادیں موجود ہیں جس سے اسلام کا قانون بین الاقوام عبارت ہے۔

حضور علیہ السلام نے تبلیغ اسلام کی ابتدا ہی میں یہ محسوس کرلیا تھا کہ مکہ کے لوگ آسانی سے مسلمان نہ ہوں گے اور سردست مکہ کو اسلام کی دعوت وتبلیغ کا مرکز بنانا دشوار ہے۔ اس لیے کوئی متبادل مقام ایسا ہونا چاہیے جسے اسلام کا مرکز بنایا جاسکے اور وہاں بیٹھ کر اسلامی معاشرے کو تشکیل دیا جاسکے۔ اس مقصد کے لیے آپ کی نظر حبشہ پر متعدد اسباب کی بنا پر پڑی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے حبشہ سے تعلقات بہت پہلے سے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے پردادا ہاشم کئی بار حبشہ گئے تھے۔ حبشہ کے حکمرانوں سے ان کے ذاتی تعلقات برسوں سے چلے آتے تھے اور انہوں نے ذاتی طور پر شاہِ حبشہ سے کہہ کر اہلِ مکہ کو تجارتی مراعات دلائی تھیں۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا

عبدالمطلب بھی حبشہ تشریف لے جاچکے تھے۔ حضور کے سرپرست اور چچا ابو طالب کے بھی شاہانِ حبشہ سے ذاتی سے مراسم تھے۔ کتبِ سیرت میں شاہان حبشہ کے نام ابو طالب کے خطوط اور مدحیہ اشعار کا ذکر ملتا ہے۔ ممکن ہے ابو طالب کے تجارتی سفروں میں حبشہ کے سفر میں ان کے ساتھ اپنے بچپن میں حضور علیہ السلام بھی تشریف لے گئے ہوں۔ اِس دور کے مشہور مفکر و محقق ڈاکٹر حمید اللہ کا خیال ہے کہ اس بات کے قوی امکانات موجود ہیں کہ خود حضور علیہ السلام بھی ایک آدھ مرتبہ حبشہ تشریف لے گئے ہوں اور کسی موقع اور مقام پر شاہ حبشہ سے آپ کی شخصی ملاقات ہوئی ہو(۴)۔ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مواقع پر حبشی زبان کے الفاظ بھی استعمال فرمائے اور حبشہ سے آنے والوں سے حبشی زبان میں گفتگو فرمائی۔ اس سے مذکورہ امکان کو مزید تقویت ملتی ہے۔ مزید برآں جب مہاجرین صحابہؓ کا یہ وفد حضرت جعفر طیارؓ کی سربراہی میں حبشہ کے لیے روانہ ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نامہ مبارک شاہِ حبشہ کے نام لکھا۔ اس کا مضمون یہ تھا کہ میرے قبیلہ کے لوگ اور میرے بھائی آپ کے ہاں آرہے ہیں، امید ہے آپ ان کی مدد کریں گے(۵)۔ ڈاکٹر حمید اللہ کا خیال ہے کہ اس قسم کا خط وہی شخص لکھ سکتا ہے جو پہلے سے مکتوب الیہ سے ذاتی طور پر متعارف ہو۔ دو نا واقف افراد میں اس قسم کی خط و کتابت نہیں ہوا کرتی۔ اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ کاتب اور مکتوب الیہ پہلے سے باہم متعارف تھے اور خود مکہ مکرمہ میں قائدانہ کردار رکھتے تھے۔ یہ لوگ اتنے ممتاز تھے کہ کسی بھی مرحلہ پر وہاں (حبشہ میں) اگر کوئی مسلم یا اسلامی ریاست وجود میں آجاتی تو یہ حضرات بلاشبہ اس نئی وجود میں آنے والی مملکت کو چلا سکتے تھے۔ آخر انہی میں سے چار حضرات وہ تھے جن کا نام بعد میں وقتاً فوقتاً خلافتِ رسول اور اسلامی ریاست کی سربراہی کے لیے لیا گیا۔ ایک اہم وجہ تو یہ معلوم ہوتی ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اگر ہم مکہ اور حبشہ کے تجارتی تعلقات کا جائزہ لیں تو

پتا چلتا ہے کہ یہ روابط خاصے مضبوط اور مربوط تھے۔ ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خیال یہ ہوا ہو کہ اہل مکہ کے لیے حبشہ کی یہ تجارت بڑا اہم ذریعہ منفعت ہے۔ اگر اہل مکہ اور ان کے اس تجارتی مفادات پر شاہِ حبشہ سے اس شخصی رابطہ کے ذریعے اقتصادی دباؤ ڈالا جائے تو ہو سکتا ہے کہ اہل مکہ مسلمانوں کے بارے میں سختی کا رویہ ترک کر دیں اور اس طرح مکہ کا ماحول مسلمانوں کے لیے سازگار ہو جائے اور اس کے نتیجہ میں یہاں مکہ میں دعوت و تبلیغ کا کام آسان ہو جائے۔ ہجرتِ حبشہ کی جو تفصیلات کتبِ سیرت اور حدیث میں ملتی ہیں ان پر نظر ڈالنے سے یہ دو اسباب واضح طور پر سامنے آتے ہیں۔

علاوہ ازیں ہجرت کے اس چھوٹے سے واقعے سے جس میں پہلے پندرہ اور پھر ایک سو تین افراد نے شرکت کی، کچھ اور اہم نتائج بھی ہمارے سامنے آتے ہیں:

۱۔ سب سے پہلے تو یہ کہ اہل عرب اور خود حبشہ کے لوگوں کے لیے یہ اس بات کا اعلان تھا کہ اسلام کا یہ پیغام ایک بین الاقوامی اور بین الانسانی پیغام ہے جو نہ کسی علاقے سے وابستہ ہے اور نہ کسی قبیلہ یا زبان سے۔ یہ بات نظری طور پر پہلے روز سے کہی جا رہی تھی لیکن اب اس کا عملی اظہار بین الاقوامی سطح پر بڑی کامیابی سے کر دیا گیا۔

۲۔ یہ ایک ایسی نظریاتی اور سیاسی فتح تھی جس نے قریش مکہ کو یہ پیغام دے دیا کہ مسلمان کوئی بے سہارا مخلوق نہیں ہیں بلکہ اسلامی تحریک کے بین الاقوامی روابط موجود ہیں اور قرب و جوار کے حکمرانوں سے اس کے دوستانہ تعلقات قائم ہیں جن کی وجہ سے وہ مکہ سے ترک وطن کر کے کہیں بھی منتقل ہو سکتے ہیں۔

۳۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے حبشہ کے بارہ میں یہ ارشاد کہ وہ سچائی اور انصاف کی سرزمین ہے، بین الاقوامی رواداری کا ایک بڑا اہم واقعہ ہے۔ اس میں ایک ایسے مذہب کے ماننے والوں کو جو اسلام سے عقائد و تعلیمات کے لحاظ مختلف تھا اور جو اسلام لانے والے رسول کو نبی بھی تسلیم نہیں کرتا تھا، یہ سند عطا فرمائی گئی کہ

وہ سچائی اورعدل کی سرزمین ہے۔ یہ واقعہ تعلیم دیتا ہے کہ مسلمان ہرکہیں سچائی اور بھلائی کا حامی اور متلاشی ہے اور اس کا کھلے دل سے اعتراف بھی کرتا ہے۔ سچائی اور عدل و انصاف جہاں اور جس حالت میں ہو اس کی تعریف کی جانی چاہیے۔

۴۔ ایک اور اہم بات جو اس واقعے سے ہمارے سامنے آتی ہے اور جو قرآن پاک کی کئی آیات میں بھی واضح طور پر بیان کی گئی ہے، یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے بت پرستانہ اور مشرکانہ نظریات کے مقابلے میں دیگر آسمانی مذاہب سے دوستانہ رویہ رکھنا چاہیے اور ایسے آسمانی مذاہب سے مل کر جو اسلام سے زیادہ قربت رکھتے ہوں، کفر وشرک اور الحاد کے خلاف ایک مشترکہ پلیٹ فارم بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ واقعہ حبشہ کے تقریباً دس سال بعد اسلام نے دنیا کے اہل کتاب کو دعوت دی کہ آؤ تمہارے اور ہمارے درمیان جو مشترک عقائد و اعمال ہیں ان کی بنیاد پر ہم اکٹھے ہو جائیں۔ اس اشتراکِ عمل کا آغاز حضور علیہ السلام نے اس دعوتِ اشتراک کے نزول سے دس سال پہلے ہی ہجرت حبشہ کی صورت میں فرما دیا تھا کہ کفار مکہ جو کہ نسلی ونسبی لحاظ سے حضور علیہ السلام کے اپنے لوگ تھے، ان کے مقابلے میں حبشہ کے عیسائیوں کو ترجیح دی۔

۵۔ پھر ہجرت حبشہ عملاً اس بات کا اعلان تھی کہ ہم لسانی، علاقائی اور ایسے ہی دیگر رشتوں کو تسلیم نہیں کرتے۔ ہم نے اپنوں کو چھوڑ کر ایسے علاقے میں جانے کو ترجیح دی جس کی زبان بھی مختلف، جس کا رنگ بھی مختلف، جس کا علاقہ بھی مختلف اور جس کی نسل بھی مختلف ہے۔

۶۔ سب سے بڑا اور سب سے اہم سبب یہ اصول تھا کہ مسلمانوں کو بین الاقوامی تعلقات میں عام طور پر اور اپنی بین الاقوامی دعوت میں خاص طور پر تجارتی تعلقات کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ اگر کسی قوم سے اچھے تجارتی تعلقات قائم ہوں تو وہاں دعوت دین کا کام نسبتاً آسان اور بہتر انداز میں ہو سکے گا۔ مسلمانوں نے چین، ملائیشیا،

انڈونیشیا اور اسی طرح افریقہ کے بہت سے علاقوں میں دعوتِ دین کے لیے تجارتی تعلقات سے فائدہ اٹھایا۔ یہ عنصر ہجرت حبشہ میں پہلی بار ہمارے سامنے آیا کہ تجارت کے ذرائع سے دعوت کے مقاصد کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے اور دوستانہ تجارتی تعلقات پیدا کر کے مخالفین اسلام پر دباؤ بڑھایا جا سکتا ہے۔

یہ تو ہجرت کے وہ تاریخی، نظری اور روحانی پہلو تھے جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بیان فرمایا لیکن اس تصورِ ہجرت سے بین الاقوامی، سیاسی اور انتظامی نوعیت کے بھی بہت سے اصول سامنے آئے۔ ہجرت کے بعد مکہ اور اس کے قرب وجوار میں جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو مکہ کے گردونواح میں رہتے تھے ان کو تلقین کی گئی کہ وہ ہجرت کر کے مدینہ منورہ آجائیں۔ اس کے دو بنیادی اسباب تھے، ایک تو یہ کہ اگر کوئی مسلمان انفرادی طور پر غیر مسلم قبیلہ میں رہے گا تو وہاں کے غیر اسلامی ماحول میں وہ تربیت وتزکیہ حاصل نہ کر سکے گا جو مدینہ منورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیر تربیت ہو رہی تھی۔ بلکہ اس بات کا بھی امکان موجود تھا کہ وہاں کے غیر اسلامی ماحول ہی میں وہ دوبارہ جذب ہو جائے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ مدینہ منورہ کے مسلمان جو ابھی تک ایک قلیل اقلیت میں تھے ان کی تعداد میں اضافہ اس نئی اسلامی ریاست کی مزید مضبوطی کا باعث بنتا۔ اس کے برعکس اگر مکہ کے اردگرد کوئی بڑا گروہ یا قبیلہ مسلمان ہوا تو آپ نے اس کو ہجرت کا حکم نہیں دیا، آپ نے فرمایا کہ تم جہاں ہو وہیں مہاجر ہو(۲)۔ سیرت نبوی کے مطالعہ سے متعدد ایسے واقعات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ پورا قبیلہ مسلمان ہو گیا، لیکن اس قبیلے کے لوگوں کو مدینے آکر بسنے کی تلقین نہیں کی گئی۔ اس لیے کہ اسلامی معاشرے جتنے زیادہ اور جہاں جہاں قائم ہوں گے تبلیغ ودعوت کا کام اتنا ہی آسان ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ایک فرد کے مقابلے میں ایک قبیلہ ایک مکمل معاشرہ تھا، لہذا جب ہجرت کا یہ عمل مکمل ہو گیا تو اس نے ایک ایسا بین الاقوامی معاشرہ قائم کر دیا جو اسلامی معیار اور قرآنی اعتبار سے

مکمل اور قابل تقلید معاشرہ تھا۔ تکمیل ہجرت نے آئندہ کے لیے دعوتِ دین کا کام آسان کر دیا اور اس طرح دنیا پر یہ ثابت کرنا آسان ہو گیا کہ مسلم امت جغرافیائی، لسانی، ثقافتی اور علاقائی بندھنوں سے آزاد اور بالاتر ہے اور اس کا مزاج بین الانسانی، خمیر نظریاتی، ضمیر اخلاقی اور ساخت عالمگیر ہے۔

ہجرت کے سلسلے میں مذکورہ بالا نظری اور روحانی پہلوؤں کے علاوہ ایک اور اہم سیاسی اور انتظامی پہلو بھی قابل غور ہے۔ مدینہ منورہ کی ننھی منی شہری ریاست میں ہجرت کے کئی سال بعد تک مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی۔ وہاں کے باشندوں کی اکثریت کئی سال تک یہودیوں اور دوسرے غیر مسلموں پر مشتمل رہی۔ منافقین ان کے علاوہ تھے جن کی تعداد بھی ہزاروں میں نہیں تو سینکڑوں میں تو ضرور رہی تھی۔ ان حالات میں مدینہ میں مسلم آبادی کے اضافہ پر ہی ریاست کی بقا کا دارومدار تھا۔ افراد کے بارے میں ہمیشہ کوشش کی جاتی رہی کہ جیسے جیسے دور دراز کے علاقوں سے اکّا دکّا لوگ اسلام قبول کرتے جائیں وہ ہجرت کر کے مدینہ آتے جائیں تاکہ وہ غیر اسلامی معاشرے میں اپنا تشخص گنوا نہ بیٹھیں اور ان کی آئندہ نسلیں دوبارہ غیر اسلامی معاشرے کا حصہ نہ بن جائیں لیکن جہاں جہاں اس کا خطرہ نہیں تھا وہاں اس کو ضروری قرار نہیں دیا گیا۔ مثلاً یمن کے بعض قبائل نے اجتماعی طور پر اسلام قبول کیا، اسی طرح قبیلہ مزینہ جو مدینہ سے پچیس تیس میل کے فاصلے پر آباد تھا، اس کے لوگوں نے بڑی تعداد میں اسلام قبول کیا۔ قبیلہ خزاعہ جو مکہ کے قریب آباد تھا، اس کے بیشتر لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے تو ان قبائل کو مدینے آنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ اس لیے کہ پوری بستی نے اسلام قبول کر کے گویا سارے قبیلہ اور پوری بستی ہی کی حیثیت کو بدل دیا اور اپنے علاقہ کو دارالاسلام کی حیثیت دے دی۔ اب وہاں اس بات کا خطرہ نہیں تھا کہ وہاں کے مسلمان غیر اسلامی معاشرہ میں

ہونے کی وجہ سے اپنا اسلامی تشخص کھو بیٹھیں گے۔

ہجرت کا ایک اور اہم سیاسی اور انتظامی نتیجہ بھی نکلا۔ شہر مدینہ بہت جلد ایک کسمو پولیٹن (Cosmopoliton) شہر بن گیا جہاں مختلف زبانیں بولنے والے اور مختلف علاقائی پس منظر رکھنے والے باشندے بڑی تعداد میں نظر آنے لگے۔ یوں دیکھتے دیکھتے مدینہ سے علاقائیت اور قبائلیت کا رنگ ختم ہوگیا اور اسلامی عالمگیریت کے مظاہر سامنے آنے لگے۔ اسی مدینہ کو مرکز بنا کر لوگ دور دراز علاقوں میں خصوصاً جن علاقوں سے ان کا اپنا تعلق ہوتا تھا، دعوتِ دین کے لیے نکلنے لگے۔ علاوہ ازیں مدینہ منورہ سے لوگ دعوتِ دین کے ساتھ ساتھ تجارتی مقاصد کے لیے بھی باہر جاتے تھے اور جہاں جہاں جاتے تھے وہاں اسلام کا پیغام بھی ساتھ لے جاتے تھے۔

حضور علیہ السلام جب مدینہ تشریف لائے اور مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کی تشکیل کا کام مکمل ہوگیا تو آپ نے آس پاس کے بعض قبائل سے معاہدے کیے جن میں بنوسلیم اور جہینہ نامی قبیلے نمایاں تھے، ان سے دوستی اور عدم جنگ کے معاہدے کیے۔ ایک قبیلہ تھا جن سے جنگ بدر کے قریب معاہدہ کیا گیا اور جس میں طے کیا گیا کہ وہ مسلمانوں پر حملہ نہ کریں گے اور مسلمان ان پر حملہ نہ کریں گے۔ اگر اسلامی ریاست کسی بیرونی طاقت کے خلاف جنگ کرے گی تو یہ اس کی مدد کے پابند نہ ہوں گے۔ البتہ اگر کوئی غیر مسلم طاقت مدینہ منورہ پر حملہ آور ہو تو یہ اس صورت میں مدد دیں گے۔ یہ واقعتاً ایک بین الاقوامی نوعیت کا معاہدہ ہے جس میں ایک مسلم ریاست نے دوسری آزاد ریاست سے برابری کی سطح پر تعلقات قائم کیے ہیں۔

اسلام نے ابتدا ہی سے اس اہم بین الاقوامی عنصر کی اہمیت کو پیش نظر رکھا ہے۔ قرآن مجید اور سنّت و سیرتِ رسول علیہ السلام میں ایسے احکام اور واقعات موجود ہیں جنہوں نے تجارت کی بین الاقوامی اہمیت اور مسلمانوں کے بین الاقوامی مفادات کے

لیے اس کو فروغ دینے اور آگے بڑھانے پر زور دیا ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بین الاقوامی تجارت اور اس کی سیاسی و سفارتی جہتوں سے واقفیت گویا گھر کی لونڈی تھی اور کئی پشتوں سے آپ کے اجداد کرام کا پیشہ اسی کی خاطر دشت نوردی تھا۔ آپ کے جد امجد جناب ہاشم ایک بین الاقوامی تاجر تھے جن کے تعلقات قیصر روم سے ہمیشہ سے چلے آتے تھے۔ وہ وہاں کثرت سے آیا جایا کرتے تھے۔ انہوں ہی نے عربوں کو وہاں تجارتی مراعات دلائی تھیں۔ ان کے حبشہ کے نجاشی سے بھی تعلقات دوستانہ اور خوشگوار تھے۔ حضور علیہ السلام کے دادا حضرت عبدالمطلب نے ان تعلقات کو نہ صرف باقی رکھا بلکہ فروغ بھی دیا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تعلقات کو اسلامی دعوت اور امت کے مفاد کے لیے پورے طور پر استعمال کیا۔ قرآن پاک نے ایلاف کا ذکر کیا ہے اور تجارت اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی دولت اور امن وسکون کو اللہ تعالیٰ کی ایک بیش بہا نعمت قرار دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بہت سے جلیل القدر صحابہ کرامؓ بین الاقوامی شہرت کے حامل تاجر تھے۔ انہوں نے اپنے اس اہم کاروباری مقام اور تجارتی حیثیت کو اسلامی دعوت کی خاطر استعمال کیا۔ خود حبشہ کی ہجرت جس میں دیگر متعدد مصالح کے علاوہ ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ دشمن پر ایک اقتصادی دباؤ ڈالا جائے اور اس کے تجارتی کارواں کو روکا جائے تاکہ اس کے معاشی مفادات پر ضرب پڑے اور وہ دباؤ محسوس کرے۔ مسلمانوں کی طرف سے جو وفد وہاں گیا تھا وہ سب تجارت پیشہ حضرات پر مشتمل تھا۔ قریش کی طرف سے جو وفد مسلمانوں کے مقابل بھیجا گیا وہ بھی تاجروں ہی پر مشتمل تھا۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ تشریف لانے کے بعد اسلامی ریاست کی سرحدوں کو محفوظ بنانے اور دعوتِ اسلامی کی پرامن توسیع کے کام کو یقینی بنانے کے لیے اقدامات کیے، ان میں یہ کوشش بھی تھی کہ قریش مکہ کا تجارتی مقاطعہ کیا جائے اور ان پر

تجارتی اور معاشی پہلوؤں سے ایسا دباؤ ڈالا جائے کہ وہ اسلام کے راستے میں رکاوٹ نہ بنیں۔ غزوہ بدر کس لیے ہوا؟ اس لیے کہ مسلمانوں نے اس تجارتی قافلے کو روکنا چاہا جس کے مال تجارت سے ہونے والا نفع بالآخر مسلمانوں کے خلاف استعمال ہونا تھا(۷)۔ ایک مشہور صحابی ثمامہ بن اثال جن کا تعلق یمامہ سے ہے وہ اسلام قبول کرتے ہیں اور اپنی حکومت کو اطلاع دیتے ہیں کہ وہ قریش کے قافلوں کی آمدورفت کو اپنے علاقہ میں روک دیں اور قریش کو وہاں کی تجارت سے محروم کردیں۔ اس اقدام نے قریش مکہ کی نیندیں حرام کردیں اور ان کو معلوم ہوگیا کہ اسلامی دعوت کا راستہ روکنے کے نتائج کیا ہو سکتے ہیں۔

جب حضور علیہ السلام مدینہ منورہ تشریف لے آئے تو پھر آپ نے مدینے کے باہر کے قبائل سے معاہدہ جات کا ایک سلسلہ شروع کیا اور مدینہ منورہ کے چاروں طرف بسنے والے قبائل سے دوستی اور عدم جنگ کے معاہدے کر کے مدینہ کی شہری ریاست کے دفاع کو مضبوط فرمایا۔ پھر جن جن ممکنہ دشمنوں اور مخالفین سے خطرہ ہوسکتا تھا کہ یہ مدینے پر حملہ کر سکتے ہیں ان کے قرب وجوار میں چاروں طرف اپنی دوستیاں پیدا کیں، قبائل سے تعلقات قائم فرمائے تا کہ اگر دشمن حملہ کرے تو اسے پے در پے مسلم دوست علاقوں سے گزرنا اور وہاں مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے۔ ان سب معاہدہ جات اور انتظامات کی تفصیلات بڑی طویل گفتگو کی متقاضی ہیں۔ ان معاہدہ جات کی تفصیلات اور ان کے سیاسی اور دینی اثرات پر ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اپنی فرانسیسی سیرت نبوی میں بڑی تفصیل اور وقت نظر سے بحث کی ہے۔ یہ تفصیلات اس بات کو ظاہر کرتی ہیں کہ اسلام کا قانون بین الاقوامی روز اوّل سے ہی حقیقی معنوں میں بین الاقوامی نوعیت کا تھا۔ ان بھرپور بین الاقوامی اور بین البراعظمی تعلقات کو منظم کرنے کے لیے پہلے دن سے ہی بین الاقوامی قانون کی ضرورت تھی۔ مدینہ منوّرہ کی اس ابھرتی ہوئی نظریاتی ریاست کو ضرورت تھی کہ وہ اپنے

نظریۂ حیات کی دعوت کا ایسا نظام ترتیب دے جس سے کام لے کر دنیا بھر میں اسلام کے پیغام کو عام کیا جا سکے۔ جو مسلمانوں کو اتنی داخلی خود مختاری اور امن و امان فراہم کر دے کہ وہ بسہولت اپنا دین اور نظام شریعت نافذ کر سکیں جو آنے والے ادوار میں ہر لحاظ سے مکمل مجموعہ حیات ہو، ایسا مجموعہ حیات جس کی دعوت اسلام دیتا ہے۔

مدینہ منورہ ہجرت کے فوراً بعد دو تین سالوں میں عرب قبائل سے بہت سے معاہدے کیے گئے، لیکن بین الاقوامی تعلقات کے حوالے سے ان میں سب سے اہم معاہدہ میثاقِ مدینہ ہے جس سے سیرت کا ہر طالب علم واقف ہے۔ خوش قسمتی سے اس تاریخی دستاویز کا مکمل متن آج ہمارے پاس موجود ہے۔ اس دستاویز کو مختلف مؤرخین نے مختلف عنوانات سے یاد کیا ہے۔ اس کو دنیا کا پہلا تحریری دستور بھی بجا طور پر کہا گیا ہے۔ دورِ جدید کے مشہور محقق سیرت ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اس پر انگریزی میں ایک کتاب بھی لکھی ہے جس کا عنوان ہی ہے: دنیا کا پہلا تحریری دستور۔ تاہم واقعہ یہ ہے کہ اس دستاویز کی حیثیت ایک ریاست کے دستور سے بڑھ کر ہے۔ اس میں کسی دستور و آئین کی طرح انتظامی دفعات بھی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ایک بین الاقوامی نوعیت کے معاہدہ کی خصوصیات بھی اس میں پائی جاتی ہیں۔ بلاشبہ اس کی دستوری دفعات اور آئینی انتظامات کے پیش نظر اس کو دنیا کا پہلا تحریری دستور کہا جا سکتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کو بین الاقوامی تعلقات کی تاریخ کی ایک اہم اور ایک بڑی دستاویز کی حیثیت بھی حاصل رہے گی۔ اس دستاویز میں جو چیز سب سے نمایاں نظر آتی ہے وہ ایسے قواعد احکام ہیں جو پہلی بار اس دستاویز میں دیے گئے جن سے اسلام کے قانون بین الاقوام میں بہت سے اصول اخذ کیے گئے اور بہت سے قواعد وکلیات اس میثاق کی بنیاد پر مرتب کیے گئے۔ اس معاہدہ یا تحریر نے خود مدینہ کے متحارب قبائل کے مابین قائم اس سوا سو سالہ جنگ کو ختم کر دیا جس نے مدینے کی معاشرت کو تباہ کر دیا تھا۔ پھر مدینہ منورہ سے باہر یہودیوں کے جو درجنوں

قبائل آباد تھے جن میں قبائل یعنی بنوالنضیر، بنو قینقاع اور بنو قریظہ نسبتاً زیادہ معروف اور بااثر تھے، اس طرح اس معاہدہ میں فریق بن گئے کہ ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے قانون بین الممالک کی عالمی برتری کو تسلیم کرالیا۔ اس سے یہ پیغام بھی خود بخود ملتا ہے کہ اسلام کی دعوت کا مقصد اوّلین اور قانون بین الاقوام کا محرّک اوّلین اسلام کی بالادستی اور شریعت اسلامی کی حاکمیت ہے۔

میثاقِ مدینہ جس زمانے میں مرتب کیا گیا اسی زمانے میں مسلمانوں کو بہت سی جنگوں کا سامنا کرنا پڑا۔ غزوہ تبوک تک درجنوں معرکے ایسے پیش آئے جن میں خود سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس تشریف لے گئے۔ بہت سے معرکے ایسے ہیں جن میں آپ خود تو تشریف نہیں لے گئے لیکن یہ معرکے آپ کے حکم سے ہوئے۔ ان فوجی دستوں اور عسکری مہمات کو بھیجتے وقت حضور علیہ السلام نے بہت سی ہدایات دیں اور جنگ و صلح کے بہت سے احکام بیان فرمائے۔ متعدد مواقع پر قرآن پاک کی آیات بھی نازل ہوئیں اور ان میں سے اہم واقعات پر قرآن نے تبصرے کیے۔ غزوہ بدر کے بارے میں سورت الانفال میں تبصرہ کیا گیا۔ غزوہ احد پر سورت آل عمران میں، غزوہ احزاب پر سورت الاحزاب میں تبصرہ اور غزوہ تبوک پر سورت التوبہ میں قرآن پاک کا تبصرہ مشہور و معروف ہیں۔ یہ محض تبصرے ہی نہیں بلکہ ان میں مفصل قانونی احکام بھی ہیں، اخلاقی ہدایات بھی ہیں اور بین الممالک قانون کے اصول وقواعد بھی ہیں۔ ان آیات و تبصروں میں مسلمانوں کے طرز عمل کی خوبیاں اور کمزوریاں بیان کی گئیں، خوبیوں کو سراہا گیا اور تسامحات کے بارے میں مناسب ہدایات دی گئیں ہیں۔

حواشی

۱۔ حضرت کعب بن زہیرؓ کا یہ شعر یوں بھی روایت ہوا ہے:

ان الرسول لنور يستضاء به

مهند من سيوف الله مسلول

ملاحظہ ہو: ابن ہشام، ابو محمد عبدالملک (م ۲۱۸ھ)، السیرۃ النبویۃ، دار احیاء التراث العربی، بیروت لبنان ۱۶۶/۴

ان الرسول لسيف يستضاء به

مهند من سيوف الله مسلول

ملاحظہ ہو: بیہقی، ابوبکر احمد بن الحسین (م ۴۵۸ھ) دلائل النبوۃ و معرفۃ الاحوال صاحب الشریعۃ، دارالکتب العلمیۃ، بیروت لبنان، المکتبۃ الاثریۃ، اردو بازار لاہور

۲۔ یہ واقعہ مشہور کتب احادیث، سیرت اور تاریخ میں نہیں مل سکا۔ علامہ ابن ہشام انصاری (م ۷۶۱ھ) نے لکھا ہے:

و يُروى أن كعباً رضي الله عنه أنشد: من سيوف الهند،

فقال النبي صلى الله عليه وسلم: من سيوف الله۔

یہ روایت کیا گیا ہے کہ حضرت کعبؓ نے یہ پڑھا: من سیوف الہند۔

اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من سیوف اللہ۔

ملاحظہ ہو: جمال الدین محمد بن ہشام الانصاری (م ۷۶۱ھ)، شرح قصیدۃ کعب بن زہیر فی مدح سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، الوکالۃ العامۃ للتوزیع، دمشق ۱۴۰۱ھ/۱۹۸۱ء، طبع اول، صفحہ ۲۹۰

۳۔ ملاحظہ ہو: طبری، ابوجعفر محمد بن جریر (م ۳۱۰ھ)، تاریخ الامم و الملوک، سنۃ ۲، مطبعۃ الاستقامۃ بالقاہرۃ ۱۳۸۵ھ/۱۹۳۹ء، ۲۹۶/۲

۴۔ محمد حمید اللہ، خطبات بہاولپور، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد ۱۹۸۵ء ص ۴۰۴

۵۔ ملاحظہ ہو: طبری، تاریخ الامم و الملوک، سنة ٦، ۲/ ۲۹۴

٦۔ سعید بن ایاس بن سلمہ بن الاکوع روایت کرتے ہیں کہ ان کے والد نے بیان کیا کہ حضرت سلمہؓ مدینہ آئے۔ ان سے حضرت بریدہؓ ملے اور کہا: اے سلمہ! آپ نے اپنی ہجرت کو چھوڑ دیا ہے؟ حضرت سلمہؓ نے فرمایا: معاذ اللہ، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے ایسا کیا ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا: اے بنو اسلم! گاوں میں رہو، ہواؤں سے لطف اندوز ہو اور گھاٹیوں میں رہو۔ لوگوں نے کہا: یا رسول اللہ! ہمیں ڈر ہے کہ اس سے ہماری ہجرت کو نقصان ہوگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انتم مهاجرون حيث كنتم

تم جہاں ہو، وہیں مہاجر ہو

ملاحظہ ہو: مسند الامام احمد بن حنبل، بقية حديث ابن الاكوع، دار الفكر ۴/ ۵۵

۷۔ ابن ہشام، السيرة النبوية ۲/ ۲۱۹

☆☆☆☆
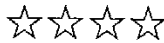
یوں تو سیرت کا ہر پہلو، ہر دور اور ہر زمانے میں امت مسلمہ کے لیے بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے لیکن حالات و زمانے کے لحاظ سے بعض پہلوؤں کو ازسر تو اجاگر کرنا زیادہ ضروری ہوتا ہے۔ موجودہ دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریعی حیثیت کو مدلل و علمی انداز میں پیش کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اس لیے کہ بعض حلقوں کی طرف سے دانستہ یہ تاثر دیا جا رہا ہے کہ قرآن و سنت کی راہنمائی صرف عبادات تک محدود ہے، اور جہاں تک دیگر معاملات کا تعلق ہے وہاں انسان اپنے امور خود طے کر سکتا ہے، اسے وحی کی رہنمائی کی ضرورت نہیں۔ اس کتاب کا بنیادی مقصد اسی غلط فہمی کا ازالہ کرنا ہے۔ یہ کتاب دراصل مجموعۂ مقالات ہے اور اس میں جن اہل علم حضرات کے مضامین کا انتخاب کیا گیا ہے ان کی علمی و فکری حیثیت مسلمہ ہے اور مقالات بغیر کسی ترمیم و اضافے کے شامل کیے گئے ہیں البتہ بعض مقامات پر ضروری حوالہ جات اور تخریج و حواشی کا اضافہ کیا گیا ہے۔

شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اپنے قیام ۱۹۸۱ء سے ہی اسلامی قانون سے آگاہی اور اس کی ترویج و اشاعت میں اپنا کردار ادا کر رہی ہے۔ اکیڈمی کے تربیتی پروگراموں میں تحصیل اور ضلع کی سطح کے جج صاحبان اور ملک بھر کے سول و فوجی اداروں کے شعبہ ہائے قانون کے افسران، نیز عملی میدان میں مصروف کار وکلا اور ملک بھر سے آنے والے مفتیان کرام کو اسلامی قانون کے تعارفی کورس کرائے جاتے ہیں۔ مفتی صاحبان کے کورسز میں اسلامی قانون کے ساتھ ساتھ رائج الوقت جدید قانون کا تعارف بھی شامل ہوتا ہے۔ جدید معیشت و تجارت کے تعارفی پروگرام بھی اسی سلسلے کا حصہ ہیں۔ اکیڈمی کا دوسرا بڑا پروگرام خط و کتابت کورسز کے ذریعے جدید پڑھے لکھے طبقے میں فقہ اور اسلامی قانون کا شعور بیدار کرنا ہے۔ اکیڈمی کے اشاعتی پروگراموں میں فقہ و اصول فقہ کی امہات الکتب کے اردو تراجم، جدید قانونی موضوعات پر اسلامی نقطۂ نظر کی تحقیقی عربی کتب کے تراجم، جدید قانونی مسائل پر مبنی تحقیقی تصانیف، ایل ایل بی، ایل ایل ایم اور پی ایچ ڈی کی سطح کی نصابی کتب، مختلف قانونی موضوعات پر یک موضوعاتی کتابچے اور مراسلاتی کورس کے لیے یونٹس کی تیاری اور اشاعت شامل ہے۔